جنگ آزادی اور یوم جمہوریہ

کی مختصر تاریخ

مسلمانوں کی قربانیوں کے پس منظر میں

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء و ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء اور قومی پرچم

مفتی محمد سرور فاروقی ندوی
(استاذ: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر جمعیت پیام امن، لکھنؤ)

مکتبہ پیام امن
ندوہ روڈ، ڈالی گنج لکھنؤ، یوپی، الھند

U-66

جملہ حقوق محفوظ

نام : جنگ آزادی اور یوم جمہوریہ کی مختصر تاریخ (مسلمانوں کی قربانیوں کے پس منظر میں)
مصنف : مفتی محمد سرور فاروقی ندوی
ناشر : مکتبہ پیامِ امن، ندوہ روڈ، ڈالی گنج، لکھنؤ
اردو ایڈیشن : جدید ایڈیشن مع اضافہ شدہ
تعداد کتب : ۱۰۰۰
سال : سنہ ۲۰۱۳ء
قیمت : ۸۰

Writer :	Mufti Mohd Sarwar Farooqui Nadwi
Book Name:	Jung-e-Azadi Aur Youm-e-Jamhuriya
Publisher :	Maktaba Payam-e-Amn, Nadwa Road,Daliganj,lucknow 226020, UP, India
Website:	www.islamicjpamn.org
E-Mail:	tasneemlko2012@gmail.com
Phone No.	9984490150, 9919042879

ملنے کے پتے

۱۔ مجلس تحقیقات ونشریات، ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ (لکھنؤ)	05222741539
۲۔ نیوسلور بک ایجنسی، 14، محمد علی روڈ، بھنڈی بازار، ممبئی	0522-27415
۳۔ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد ۳۱ (لکھنؤ)	9936635816
۴۔ سبحانیہ بک ڈپو، نیا محلہ، جبل پور، مدھیہ پردیش	9424708020
۵۔ ستیہ فاؤنڈیشن 5 182-A گرین لینڈ کیمپس، پوکھرپور، کانپور	9935044343
۶۔ مکتبہ شباب جدید، ندوہ روڈ، لکھنؤ	9198621671
۷۔ مکتبہ شاہ ولی اللہ جامع مسجد، دیوبند	8439650526

فہرست مضامین

مقدمہ ۸

باب اول۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا کردار ۱۱

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور مسلم حکومتوں کا خاتمہ ۱۲

یورپ سے تعلقات ۱۲

ابتدائی انگریز سیاح اور ناکام کوششیں ۱۳

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام ۱۳

جہانگیر کے دربار میں انگریز ۱۳

تجارتی مراکز کا پھیلاؤ ۱۴

مسلم سلطنتوں کی کمزوری اور انگریزوں کی بڑھتی طاقت ۱۴

جنگیں اور اقتدار ۱۴

مسلم حکومتوں کا خاتمہ اور برطانوی حکومت کا آغاز ۱۵

انگریزوں کی دست درازی (۱۶۹۸ء) ۱۵

کرناٹک کی جنگیں ۱۶

پہلی کرناٹک جنگ (۱۷۴۶ء سے ۱۷۴۸ء تک) ۱۶

دوسری کرناٹک جنگ (۱۷۴۹ء سے ۱۷۵۴ء تک) ۱۷

تیسری کرناٹک جنگ (۱۷۵۸ء سے ۱۷۶۳ء تک) ۱۷

مغل سلطنت کو کمزور کرنے کی سازشیں ۱۷

ہندوستان میں انگریزوں کا اصل مقصد ۱۷

مسلم حکمرانوں کا مقصد ۱۸

مغلیہ دور کا زوال ۱۸

انگریزوں کا تسلط ۱۹

شاہ ولی اللہؒ کی اصلاحی و انقلابی کوششیں ۲۰

برطانوی اثر کے خلاف بغاوت..	۲۰
اصلاحی اور فکری خدمات..	۲۰
عملی سیاسی اقدامات..	۲۱
شاہ ولی اللہؒ کے بیٹے کا فتویٰ..	۲۱
سید احمد شہیدؒ کا دور..	۲۱
حریت پسند علماء اور ان کی قربانیاں..	۲۲
علماء پر ظلم وستم..	۲۳
قید و بند اور شہادتیں..	۲۳
انگریزوں کا انتقام..	۲۴
بہادر شاہ ظفر کا انجام..	۲۴
ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کا کردار..	۲۶
انگریزوں کے خلاف منظم جنگ کی ابتدا (۱۷۵۱ء)..	۲۶
جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء اور جنگ بکسر ۱۷۶۴ء..	۲۷
حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا کردار..	۲۸
ٹیپو سلطان کی آخری جنگ اور شہادت (۱۷۹۹ء)..	۲۹
جنگ آزادی میں شاہ ولی اللہ اور ان کے شاگردوں کا کردار..	۳۰
۱۸۰۳ء کا تاریخی فتویٰ..	۳۱
سید احمد شہیدؒ اور تحریک جہاد کی عملی جدوجہد..	۳۲
تبلیغی اور عوامی بیداری..	۳۲
سرحدی علاقہ اور مجاہدین کا مرکز..	۳۲
بالاکوٹ کی جنگ..	۳۳
۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۷ء تک کی قیادت..	۳۳
اقتدار کی بنیاد..	۳۴

علماء کی تاریخی میٹنگ ۳۵
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور علماء کا عملی کردار ۳۶
شاملی کی لڑائی (۱۸۵۷ء) ۳۶
دہلی اور دیگر مقامات ۳۷
غدر یا آزادی کی لڑائی ۱۸۵۷ء ۳۷
۱۸۵۷ء میں علماء کی بغاوت ۳۹
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں علماء دیوبند کا کردار ۴۰
شاملی کی جنگ اور علماء کی قیادت ۴۰
ہجرت مکہ اور روحانی قیادت ۴۰
فتوے اور عدالتی مقدمات ۴۱
علماء کی جلاوطنی اور قربانیاں ۴۱
۱۸۶۵ء سے ۱۸۸۳ء تک علماء کی آزمائش ۴۲
۱۸۵۷ء کی فتح ۴۳
۱۸۵۷ء کی فتح اور بعد کی تعلیمی وفکری تحریکات ۴۴
دارالعلوم دیوبند ۱۸۶۶ء ۴۵
علی گڑھ تحریک ۱۸۷۵ء ۴۵
ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۸۹۴ء ۴۵
برطانیہ کے وائسرائے کی رپورٹ ۴۷
علماء کو کچلنے کی پالیسی ۴۸
قرآن کریم کی تعلیم کو محدود کرنا ۴۸
نئی تعلیمی پالیسی لارڈ میکالے کا نظام ۴۸
دینی جزبات کونشانہ ۴۹
قرآن مجید کی بے حرمتی ۴۹

علماء کے خلاف مہم ۵۰
ہزاروں علماء کی شہادت ۵۰
انگریزوں کا مقصد ۵۱
علماء کو دی جانے والی عبرت ناک سزائیں ۵۲
علماء کی قربانیاں اور تاریخی ناانصافی ۵۳
سید احمد اللہ شاہ مدراسیؒ کی غیرت ایمانی ۵۴
مدارس کو ختم کرنے کا فیصلہ ۵۴
انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۵۵
ریشمی رومال تحریک اور شیخ الہند کی قربانیاں ۵۷
شیخ الہندؒ کے شاگردوں کا کردار ۵۷
گرفتاریاں اور جلاوطنی ۵۷
تحریک کی اہمیت ۵۸
شیخ الہندؒ کی قربانیاں ۵۸
شیخ الہندؒ کے شاگرد اور معاونین ۵۹
۱۹۱۸ء میں تحریک خلافت ۵۹
۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء کا قیام ٦۰
جلیانوالہ باغ سانحہ اور خلافت تحریک ٦۰
تحریک ترک مال و بائیکاٹ ٦۱
مولانا محمد علی جوہرؒ کا انتقال ٦۲
ہندوستان چھوڑو تحریک (Quit India Movement) ٦۲
آخری دور کے علماء کی قربانیاں ٦۳
آزادی کی پہلی صبح ٦۳
شمع آزادی کے چند پروانے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴٦ء تک ٦۴

باب دوم - یوم جمہوریہ یعنی ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کا پس منظر	۶۶
یوم جمہوریہ ہند: اہمیت اور دستوری نظام........	۶۷
۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء اور دستور ہند........	۶۷
جمہوری نظام........	۶۸
دستوری خصوصیات........	۶۸
جمہوریت کے عناصر........	۶۸
یوم جمہوریہ کی اہمیت........	۶۹
آزادی اور یوم جمہوریہ........	۶۹
باب سوم - قومی پرچم اور اس کی حقیقت	۷۰
قومی پرچم کی پہچان........	۷۱
آزادی سے پہلے کے جھنڈے........	۷۱
سسٹر نویدتا کا جھنڈا ۱۹۰۴ء........	۷۱
۱۹۰۶ء کا جھنڈا........	۷۱
۱۹۰۷ء کا جھنڈا........	۷۲
۱۹۱۶ء کا جھنڈا........	۷۲
مہاتما گاندھی کا تین رنگی جھنڈا ۱۹۲۱ء........	۷۲
۱۹۳۱ء کا جھنڈا........	۷۲
آزادی کے بعد کا جھنڈا........	۷۲
ترنگا جھنڈا کی حقیقت........	۷۳
قومی پرچم اور قانونی ضابطہ........	۷۳
قومی پرچم کے لئے کچھ پابندیاں........	۷۴
خلاصہ - جنگ آزادی کی مختصر تاریخ ایک نظر میں........	۷۵

❀❀❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ قربانیوں اور ایثار کی ایسی لازوال داستان ہے جس کے اوراق خونِ شہداء سے رنگین اور بے شمار آزمائشوں سے عبارت ہیں۔ اس ملک کی آزادی کی طویل جدوجہد میں مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے صبر واستقلال، عزم وحوصلہ اور جان و مال کی قربانیوں کے بغیر تحریکِ آزادی کی تاریخ ادھوری دکھائی دیتی ہے۔

یہ وہ دور تھا جب ہماری بہنوں اور ماؤں کی عصمتوں کو پامال کیا گیا، گھروں کو لوٹا گیا، بستیوں کو اجاڑا گیا، اور ہزاروں معصوم بچے یتیم کردیے گئے۔ پانی پت وشاملی کے میدان، احمد نگر کی قیدگاہ، جلیاوالا باغ کا خونی منظر اور کالا پانی کی نحوست بھری زندگیاں سبھی اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ آزادی کا سورج طلوع کرنے کے لیے مسلمانوں نے اپنے لہو کا نذرانہ پیش کیا۔ ایک ایک دن میں درجنوں علماء کرام تختۂ دار پر لٹکادیے گئے، یہاں تک کہ دہلی کے چاندنی چوک سے لے کر لاہور تک کوئی ایسا درخت نہ تھا جس پر علماء کی لاشیں نہ لٹکی ہوں۔ ایک غیر مسلم مؤرخ لکھتا ہے کہ صرف ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں تقریباً پانچ لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ یہ اعداد وشمار اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ آزادی کی صبح مسلمانوں کے خون کی سرخی سے روشن ہوئی۔

آزادی کی اس جدوجہد میں مسلمانوں کے نعرے اور ترانے بھی ایک ولولہ انگیز کردار ادا کرتے رہے۔ ''انقلاب زندہ باد''، ''انگریز حکومت مردہ باد''، ''سرفروشی کی تمنا'' اور ''سارے جہاں سے اچھا'' جیسے نعروں نے ملک کے گوشے گوشے کو بیدار کیا اور ہندو مسلم اتحاد کی ایک ایسی مثال قائم کی جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

اس تحریک میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کردار کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ہمیشہ قومی یکجہتی اور اتحاد کے علم بردار رہے۔ ان کا یہ تاریخی قول آج بھی مشعلِ راہ ہے کہ: ''اگر ایک فرشتہ قطب مینار پر اتر کر یہ اعلان کرے کہ ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہونا پڑے، تو میں آزادی کے مقابلے میں ہندو مسلم اتحاد کو ترجیح دوں گا''۔

اسی طرح سر سید احمد خان نے ہندوستان کو ایک دلہن سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ: ''ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں، اگر ان میں سے ایک بھی ضائع ہو جائے تو دلہن کی خوبصورتی ماند پڑ جائے گی''۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی مسلمانوں کے کردار کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''ہم اس ملک کے مالی اور چمن آرا ہیں۔ اس کی تعمیر و ترقی میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اس ملک کو برباد ہوتے یا نقصان اٹھاتے دیکھ سکیں''۔

یہی وہ فکر تھی جس نے آزادی کے متوالوں کو ایک خوشحال، مساوات پر مبنی اور رواداری سے لبریز سماج کی تعمیر کے خواب سے جوڑے رکھا۔ مگر افسوس آج وہی ملک فرقہ وارانہ منافرت، بے چینی اور بحرانوں میں گھرا ہوا ہے۔ جن مدارس سے آزادی کی صدائیں بلند ہوئیں، آج انہی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہندوستان کے معماروں کا خواب یہ تھا کہ یہاں ایک ایسا معاشرہ تشکیل پائے جو مساوات، خوشحالی اور عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ ایسا معاشرہ جہاں کسی کا استحصال نہ ہو، اقلیتوں کا ملی تشخص اور بنیادی حقوق محفوظ رہیں، اور ہر فرد علمی، تعلیمی اور معاشی میدان میں اپنی محنت اور صلاحیتوں کے بل پر آگے بڑھ سکے۔ ایک ایسا وطن جہاں بدعنوانی کا ناسور جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے، جہاں امن و امان کی فضا قائم ہو، خوشحالی کی گنگا بہے اور دستور و قانون کی روشنی میں ترقی کی نئی منزلیں حاصل کی جائیں۔

لیکن افسوس! آج ہمارا ملک مختلف مسائل کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کا بنیادی

ڈھانچہ شدید بحران سے دوچار ہے، قومی مسائل روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، اور کئی ریاستیں خلفشار و اضطراب کا شکار ہیں۔ جنگل، زمین اور وسائل کی لوٹ مار کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ احتجاج کی گونج ہر سمت سنائی دیتی ہے۔ کبھی لو جہاد کا شوشہ چھوڑا جاتا ہے، کبھی چار شادیوں یا تین طلاق کے نام پر فتنہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ کبھی گائے کے گوشت کے بہانے مسلمانوں کو وحشی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو کبھی یکساں سول کوڈ کی بحث چھیڑ دی جاتی ہے۔ فضائیہ میں داڑھی کی پابندی کی باتیں ہوں یا فسادات و ظلم و ستم کے دل دہلا دینے والے مناظر، یہ سب انصاف پسند انسانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ جن مدارس نے آزادی کی صدا بلند کی تھی، آج انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ وہ درخشاں تاریخ جو ہمارے اکابرین نے اپنے خون سے رقم کی، رفتہ رفتہ فراموش کی جا رہی ہے۔ انصاف کے متلاشی اپنی عمریں گزار دیتے ہیں مگر انصاف کہیں نظر نہیں آتا۔ صوفیا و سنت کے اس ملک میں فرقہ واریت نے جڑیں پکڑ لی ہیں، اور لوگ ذات پات، طبقوں اور فرقوں میں بٹتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ملک کا جمہوری آئین، امن و آشتی، محبت و رواداری اور گنگا جمنی تہذیب کی حقیقی علامت ہے۔ یہ مساوات اور سیکولرزم کی زندہ مثال ہے، جو ہر مذہب اور ہر برادری کو اپنی پہچان برقرار رکھنے کی ضمانت دیتا ہے۔ دنیا کے دیگر جمہوری آئینوں میں ہندوستانی دستور کو جو امتیازی حیثیت حاصل ہے، وہ ہمارے لیے باعث فخر ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں بے شمار مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس ملک کو امن و امان کا گہوارہ بنائے اور ہمیں اس قابل کرے کہ اپنے اسلاف خصوصاً علماء کرام کی قربانیوں کے ثمر کو دستورِ حق کی صورت میں نافذ کریں۔ والسلام

محمد سرور فاروقی ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

07-11-2026

باب (اول)

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد
اور
جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا کردار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد
اور
مسلم حکومتوں کا خاتمہ

ہندوستان صدیوں سے ایک ایسی سرزمین رہی ہے جس نے اپنی زرخیزی، تہذیب وثقافت اور بے پناہ دولت سے دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر جدید دور تک مختلف اقوام یہاں آتی رہیں۔ یونانی، ایرانی، ترک، افغان اور وسط ایشیائی فاتحین کے بعد آخرکار یورپی اقوام نے بھی ہندوستان کو اپنی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ انہی میں انگریز بھی شامل تھے، جو ابتدا میں محض تاجر بن کر آئے لیکن رفتہ رفتہ ہندوستان کے حکمران بن بیٹھے۔

یورپ سے تعلقات

۳۲۵ قبل مسیح میں سکندر اعظم مقدونی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اگرچہ اس کی مہم زیادہ کامیاب نہ ہوئی، لیکن اس کے بعد ہندوستان یونانی دنیا کے نقشے پر نمایاں ہو گیا۔ صدیوں بعد مشہور اطالوی سیاح مارکو پولو ۱۲۹۴ء نے ہندوستان کا سفر کیا اور یہاں کی خوشحالی اور تہذیب کے نقشے یورپ کو دکھائے۔ ۱۴۹۸ء میں پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما پہلی بار براہِ راست سمندری راستے سے ہندوستان پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں یورپی طاقتوں کی آمد کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے پرتگالی آئے، پھر ڈچ، فرانسیسی اور آخرکار انگریز بھی اس دوڑ میں شامل ہوئے۔

ابتدائی انگریز سیاح اور ناکام کوششیں

مغل شہنشاہ اکبر اعظم ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک کے عہد میں ہی انگریز ہندوستان میں تجارتی تعلقات قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ اس مقصد کے لیے کچھ انگریز سیاح اور تاجر ہندوستان آئے، جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ رالف فچ (Ralph Fitch)

۲۔ جان نیو برے (John Newbery)

۳۔ اسٹوری (Story)

۴۔ لیڈس (Leedes)

تاہم یہ تمام حضرات اپنے مشن میں ناکام رہے اور انگریز ابھی ہندوستان میں قدم جمانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام

۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ملکہ الزبتھ اوّل (Queen Elizabeth I) نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کے تحت لندن کے تاجروں کو ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کمپنی کو ہندوستان اور مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کا اجارہ دار حق (Monopoly) دیا گیا۔ بظاہر یہ ادارہ صرف تجارتی مقاصد کے لیے تھا، لیکن آنے والے وقت نے ثابت کیا کہ یہ ہندوستان کی تقدیر بدلنے والا قدم تھا۔

(An Advance History of India, Page 406)

جہانگیر کے دربار میں انگریز

۱۶۰۸ء میں انگریز کپتان ولیم ہاکنس مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار میں آیا اور ہندوستان میں تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت طلب کی، مگر پرتگالیوں کی مخالفت کے باعث یہ درخواست رد کر دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد انگلستان کے بادشاہ جیمز اوّل (King James I) نے

ایک باقاعدہ سفارت کار سر تھامس (Sir Thomas Roe) روکو ہندوستان بھیجا۔ سر تھامس رو نے جہانگیر کے دربار میں تین برس تک مستقل کوششیں کیں اور بالآخر ۳۱ مئی ۱۶۲۳ء کو کمپنی کو سورت میں ایک فصیل بند تجارتی مرکز (کارخانہ) قائم کرنے کی اجازت ملی۔ یہ وہ لمحہ تھا جس نے ہندوستان میں انگریزوں کے مستقل قیام کی بنیاد ڈالی۔

(A History of India, Vol. II, Page 103)

تجارتی مراکز کا پھیلاؤ

۱۶۳۹ء میں مدراس (چنئی) کے ساحل پر ''فورٹ سینٹ جارج'' قائم کیا گیا اور ۱۶۶۱ء میں پرتگالیوں سے بمبئی انگریزوں کو ملا (یہ انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کی شادی میں جہیز کے طور پر دیا گیا تھا) پھر ۱۶۹۰ء میں کلکتہ میں تجارتی مرکز قائم کیا گیا، جو بعد میں " فورٹ ولیم " کے نام سے مشہور ہوا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک تجارتی مراکز قائم کر کے انگریز آہستہ آہستہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں جڑ پکڑنے لگے۔

مسلم سلطنتوں کی کمزوری اور انگریزوں کی بڑھتی طاقت

اورنگزیب عالمگیر کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد مغل سلطنت زوال پذیر ہونے لگی اور مختلف صوبے خودمختار ہونے لگے، دربار سازشوں کا شکار ہو گیا اور مرکزی اقتدار کمزور پڑنے لگا۔ اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے اپنی فوجی طاقت بڑھائی، ہندوستانی ریاستوں کے باہمی اختلافات کا فائدہ اٹھایا اور ایک کے بعد ایک علاقہ اپنے قبضے میں لینا شروع کیا۔

جنگیں اور اقتدار

۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی میں رابرٹ کلائیو نے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا۔ یہ جنگ انگریزوں کے سیاسی عروج کی ابتداء تھی، پھر ۱۷۶۴ء کی جنگِ بکسر کے نتیجے میں انگریزوں کو مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی

(ریونیو وصول کرنے کا حق) مل گیا اور اب انگریز تاجر نہیں بلکہ حکمران بن گئے تھے۔

مسلم حکومتوں کا خاتمہ اور برطانوی حکومت کا آغاز

۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کے سو برسوں میں انگریزوں نے ایک ایک کر کے ہندوستان کی بڑی مسلم و غیر مسلم ریاستوں کو شکست دی۔ مغل بادشاہ محض نام کے حکمران رہ گئے۔ آخر کار ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو ختم کر دیا گیا اور ہندوستان براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیر اقتدار آ گیا۔ یوں صدیوں پرانی مسلم سلطنت کا سورج غروب ہو گیا اور برطانوی راج کی سیاہ رات شروع ہو گئی۔

انگریزوں کی دست درازی (۱۶۹۸ء)

ہندوستان میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کی سب سے پہلی بڑی علامت ۱۶۹۸ء کا واقعہ ہے۔ سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز مغل سلطنت کا سب سے بڑا اور قیمتی بحری جہاز ''گنج سوائی''، جسے ''جہازِ سلطنت'' کہا جاتا تھا، انگریز قزاق ہنری ایوری (Henry Every) نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر لوٹ لیا۔ اس جہاز پر بے شمار قیمتی سامان، زیورات، سونا چاندی، اور سب سے بڑھ کر مکہ مکرمہ سے لوٹنے والے حاجی سوار تھے۔ انگریز قزاقوں نے نہ صرف قیمتی مال و دولت پر قبضہ کیا بلکہ حاجیوں کے ساتھ ظلم و زیادتی بھی کی۔

یہ خبر جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ (حکومت: ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) تک پہنچی تو ان کا غصہ بجا طور پر بھڑک اٹھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ سورت اور دیگر شہروں میں موجود تمام انگریز تاجروں کو گرفتار کر لیا جائے اور ان کے تجارتی مراکز کو بند کر دیا جائے۔ کچھ دنوں کے لیے انگریزوں کی تجارت رک گئی۔ لیکن انگریزوں نے معافی نامہ اور بھاری ہرجانہ پیش کر کے بادشاہ کو راضی کر لیا۔ یہ نرم رویہ انگریزوں کے لیے مستقبل میں بڑی سہولت ثابت ہوا، کیونکہ انہوں نے اس نرمی کو کمزوری سمجھ کر اپنی سازشوں میں مزید اضافہ کیا۔

انگریز اور فرانسیسی رقابت (۱۷۴۰ء سے ۱۷۶۳ء تک)

۱۷ویں صدی کے اختتام تک ہندوستان میں کئی یورپی طاقتیں موجود تھیں: پرتگالی، ڈچ (ولندیزی)، فرانسیسی اور انگریز۔ پرتگالی اور ڈچ وقت کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے، لیکن فرانسیسی اور انگریز میدان میں ڈٹے رہے۔ دونوں طاقتیں نہ صرف تجارت بلکہ حکمرانی کے خواب دیکھنے لگیں۔ اس طرح ہندوستان ''یورپی طاقتوں کے تصادم کا میدان'' بن گیا۔

کرناٹک کی جنگیں

۱۷۴۰ء کے بعد جنوبی ہند خصوصاً کرناٹک اور دکن کے علاقے میں انگریز اور فرانسیسی آمنے سامنے آ گئے۔ اس دور میں تین بڑی جنگیں ہوئیں جنہیں کرناٹک کی جنگیں کہا جاتا ہے:

۱۔ پہلی کرناٹک جنگ (۱۷۴۶ء سے ۱۷۴۸ء تک)

یہ جنگ بنیادی طور پر یورپ میں ہونے والی آسٹریا کے جانشین کی جنگ (War of Austrian Succession) کی توسیع تھی۔ فرانسیسی فوجی کمانڈر ''ڈوپلکس (Dupleix)'' نے مدراس (Chennai) پر قبضہ کیا، لیکن بعد میں معاہدہِ امن کے تحت یہ شہر انگریزوں کو واپس کرنا پڑا۔

۲۔ دوسری کرناٹک جنگ (۱۷۴۹ء سے ۱۷۵۴ء تک)

اس دور میں انگریز اور فرانسیسی ہندوستانی نوابوں کی جانشینی کے تنازعات میں براہِ راست شریک ہوئے۔ مدراس (کرناٹک) کی جنگوں میں انگریزوں نے محمد علی (نوابِ کارناٹک کے دعویدار) کی مدد کی، جبکہ فرانسیسیوں نے چاندہ صاحب اور حیدرآباد کے نواب مظفر جنگ کا ساتھ دیا۔ بالآخر ۱۷۵۱ء میں رابرٹ کلائیو نے کلاٹیچری (Arcot) پر قبضہ کر کے فیصلہ کن برتری حاصل کی۔ اس کامیابی نے ہندوستان میں انگریزوں کی فوجی

صلاحیت اور سیاسی اثر ورسوخ کو نمایاں کر دیا۔

۳۔ تیسری کرناٹک جنگ (۱۷۵۸ء سے ۱۷۶۳ء تک)

یہ جنگ یورپ کی سات سالہ جنگ (Seven Years' War) کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ فرانسیسیوں نے دوبارہ کوشش کی مگر انگریزوں نے فیصلہ کن فتح حاصل کی اور پلاسی (۱۷۵۷ء) وبکسر (۱۷۶۴ء) جیسی فتوحات کے بعد ہندوستان میں اپنی حکمرانی کی بنیاد ڈال دی۔

مغل سلطنت کو کمزور کرنے کی سازشیں

انگریز اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک مضبوط مغل سلطنت ان کے عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ انہوں نے پردے کے پیچھے رہ کر ایسی سازشیں شروع کیں جن کا مقصد مغل اقتدار کو کھوکھلا کرنا تھا۔ اورنگ زیبؒ کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد جانشینی کے جھگڑوں کو انگریزوں نے خوب ہوا دی۔ مغل شہزادوں اور صوبائی حکمرانوں میں تخت وتاج کے لیے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ انگریز ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت کبھی ایک نواب، کبھی دوسرے حکمران کی حمایت کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنتِ مغلیہ اندرونی طور پر کمزور ہوتی گئی اور انگریز مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے۔

ہندوستان میں انگریزوں کا اصل مقصد

انگریزوں کی ہندوستان آمد کو اکثر لوگ صرف ''تجارت'' کرنا کہتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا مقصد ''حکومت اور لوٹ کھسوٹ'' تھا۔ انہوں نے ہندوستانی صنعت وحرفت کو تباہ کیا، خاص طور پر بنگال کی کپڑا سازی، جس پر دنیا فخر کرتی تھی۔ مقامی کسان اور دستکار کنگال ہو گئے جبکہ انگلینڈ کی ملیں ہندوستان کے خام مال سے آباد ہوئیں۔ ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے بعد بنگال پر قبضہ، اور ۱۷۶۴ء کی جنگِ بکسر کے بعد مغل بادشاہ سے ''دیوانی'' (محصول جمع کرنے کا حق) حاصل کر کے انگریزوں نے عملی طور پر حکمرانی کا آغاز کر دیا۔

مسلم حکمرانوں کا مقصد

انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں جو مسلم حکمران آئے، ان کے مقصد اور طرزِ حکومت کو اگر بغور دیکھا جائے تو ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستانی راجاؤں کی دعوت پر فوج کشی کرنے والے ''محمد غوری'' اور ''نادر شاہ'' جیسے افراد لوٹ مار کے لئے آئے، باقی تمام مسلم حکمرانوں نے نہ صرف ہندوستان کو لوٹا نہیں بلکہ اسے خوشحال اور مالا مال بنایا۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جیسے قدیم دور میں آریائی قومیں ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر یہیں رچ بس گئیں، ویسے ہی مسلم اقوام بھی جو یہاں آئیں، انہوں نے نہ صرف اسے اپنا وطن سمجھا بلکہ یہیں پیوندِ خاک بھی ہوئیں۔ آج بھی ''مرکزی محکمہ آثارِ قدیمہ'' میں موجود مسلم حکمرانوں کے تعمیر کردہ آثار کو دیکھ کر ہر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر مغل شہنشاہ اورنگ زیبؒ کو لیجئے۔ انہوں نے مساجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مندروں کی دیکھ بھال اور انتظام کے لئے بھی جاگیریں عطا کیں۔ ان کے سیکڑوں فرامین آج بھی محفوظ ہیں جنہیں مشہور مؤرخ ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے نے جمع کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔

اورنگ زیبؒ کی سادگی اور تقویٰ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی وصیت میں لکھا کہ ان کی تجہیز و تکفین پر سرکاری خزانے سے ایک پیسہ بھی خرچ نہ کیا جائے، بلکہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی جو انہوں نے ٹوپیاں سِل کر اور قرآنِ مجید لکھ کر کمائی تھی اسی سے ان کا کفن دفن کیا جائے۔ چنانچہ جب ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو ان کا انتقال ہوا تو اورنگ آباد کے قریب خلد آباد میں محض ۳۰۵ روپے کی رقم سے ان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور انہیں حضرت زین الدین شیرازیؒ کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

مغلیہ دور کا زوال

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے وصال کے بعد مغلیہ سلطنت کے زوال کی گھٹائیں گہری

ہونا شروع ہوئیں۔ رفتہ رفتہ مغل شہنشاہ انگریزوں کے وظیفہ خوار بنتے گئے اور ان کی عظمت و شوکت محض نام کی رہ گئی۔ انجام کار سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے قید کر کے دیس نکالا دیا اور رنگون بھیج دیا، جہاں انہوں نے جلاوطنی کی زندگی بسر کی۔

اسی دور میں بنگال کے حاکم علی وردی خاں نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے جانشین سراج الدولہ کو نصیحت کی کہ: ''بیٹا! اگر ہندوستان کی آزادی کو قائم رکھنا چاہتے ہو تو خبردار! انگریزوں کو کبھی اس بات کی اجازت نہ دینا کہ وہ بنگال میں قلعہ تعمیر کریں یا اپنی فوج رکھیں۔''

لیکن تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ دربار ہی کے چند غدار، جیسے میر جعفر اور مانک چند، دولت و منصب کے لالچ میں دشمن سے جا ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۵۷ء کی مشہور جنگِ پلاسی میں نوخیز سراج الدولہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ شکست محض ایک نواب کی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی آزادی کی شکست تھی، جس نے برصغیر میں انگریزی اقتدار کی بنیاد ڈال دی۔

اس کے بعد انگریزوں نے میشور کے حکمراں حیدر علی اور ان کے فرزند ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ چھیڑی۔ ٹیپو سلطان نے نہ صرف مرہٹوں، نظام اور انگریزوں کی مشترکہ فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا بلکہ ہندوستان کے راجاؤں کو یہ پیغام بھی دیا کہ: ''ہندوستان صرف ہندوستانیوں کا ہے، لہٰذا سب متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف کھڑے ہو جاؤ''۔ بالآخر ۷ مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان میدانِ جنگ میں انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اسی لئے مہاتما گاندھی نے انہیں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا پہلا شہید قرار دیا۔

انگریزوں کا تسلط

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے ایک ایک کر کے ہندوستانی ریاستوں کو زیر کر لیا۔ انہوں نے بنگال، میسور، نظام، مرہٹوں اور سکھوں کو شکست دے کر

ان پر تسلط قائم کیا۔ مغلیہ سلطنت کے بادشاہ اور اودھ کے نواب بھی بالآخر ان کے وظیفہ خوار بن گئے۔ یوں آہستہ آہستہ پورا ہندوستان انگریزی اقتدار کے شکنجے میں جکڑ گیا۔

شاہ ولی اللہؒ کی اصلاحی و انقلابی کوششیں

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے وصال (۱۷۰۷ء) کے بعد برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ بادشاہت کمزور ہوتی گئی، جاگیردار خود مختار ہوتے گئے، اور انگریز تاجر آہستہ آہستہ طاقت حاصل کرنے لگے۔ ایسے نازک حالات میں ہندوستان کو ایک منظم قیادت اور نظریاتی تحریک کی سخت ضرورت تھی۔ اسی دور میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳ء سے ۱۷۶۲ء تک) کی شخصیت ایک مصلح، مجاہد اور فکری رہنما کے طور پر ابھری تھی۔

برطانوی اثر کے خلاف بغاوت

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی بصیرت افروز نگاہ نے بہت پہلے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ اگر انگریز تاجروں کی بڑھتی ہوئی تجارتی سرگرمیوں اور سیاسی چالوں کا بروقت سد باب نہ کیا گیا تو وہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے تخت و تاج کے مالک بن بیٹھیں گے۔ چنانچہ آپ نے اپنے عہد کے سلاطین اور اصحابِ اقتدار کو نہایت دردمندی کے ساتھ متنبہ کیا: ''یہ تاجر اگر قابو میں نہ لائے گئے تو کل کے فرماں روا یہی ہوں گے''۔

اصلاحی اور فکری خدمات

شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے شہنشاہ شاہ عالم ثانی (۱۷۴۸ء سے ۱۸۰۶ء تک) کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کی اور اس کو برطانوی خطرے سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اپنے قلم کو جہاد کا ہتھیار بنایا اور تحریکِ فکری و اصلاحی بیداری شروع کی۔ ان کی مشہور کتابیں ''حجۃ اللہ البالغۃ''، ''ازالۃ الخفاء'' اور ''الفوز الکبیر'' نہ صرف مذہبی رہنمائی فراہم کرتی ہیں بلکہ مسلمانوں کو سماجی، سیاسی اور عسکری بیداری کا پیغام بھی دیتی ہیں۔ وہ

اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہر بوسیدہ نظامِ حکومت کا خاتمہ جہاد کے بغیر ممکن نہیں اور یہ کہ ایک عادلانہ اور اسلامی نظام ہی ہندوستان کو بیرونی طاقتوں سے نجات دلاسکتا ہے۔

عملی سیاسی اقدامات

شاہ ولی اللہؒ نے صرف تحریروں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عملی کوشش بھی کی، انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر دہلی آنے کی دعوت دی تا کہ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے۔ نتیجتاً ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ لڑی گئی، جس میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس جنگ نے وقتی طور پر ہندوستان میں مرہٹہ تسلط کو روکا اور مسلمانوں کو ایک نئی امید بخشی۔

شاہ ولی اللہؒ کے بیٹے کا فتویٰ

شاہ ولی اللہؒ کی تحریک نے آنے والی نسلوں پر گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا کہ: ''ہندوستان اب دارالحرب ہے اور انگریزوں کے خلاف جہاد فرض ہے''۔ یہی فکر آگے چل کر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور دیگر مجاہدین کے ذریعے تحریکِ آزادی کی بنیاد بنی۔

سید احمد شہیدؒ کا دور

سید احمد شہیدؒ (۱۷۸۶ء سے ۱۸۳۱ء) برصغیر میں آزادی کی جدوجہد کے ایک عظیم رہنما تھے۔ انہوں نے ۱۸۲۴ء میں ملک بھر کا دورہ کیا اور عوام کے دلوں میں جذبۂ حریت بیدار کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ انہوں نے گوالیار کے مہاراجہ دولت راؤ سندھیا اور راجہ ہندو راؤ کو خطوط لکھ کر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف کھڑے ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ انگریز حکومت نے ہندوستانیوں کی عزت پامال کر دی ہے، لہٰذا اس کے خلاف اتحاد وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ان کی دعوت کا مقصد یہ تھا کہ حکمران طبقہ بھی عوام کے ساتھ مل کر انگریزوں کو ملک بدر کرنے میں کردار ادا کرے۔

سید احمد شہیدؒ نے اپنی عملی زندگی جہاد کے لیے وقف کی اور سرحدی علاقوں میں انگریزوں اور ان کے مقامی حلیفوں کے خلاف لڑائیاں لڑیں۔ بالآخر ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں ایک معرکے کے دوران وہ اپنے رفقاء سمیت شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت اگرچہ وقتی طور پر نقصان ثابت ہوئی لیکن ان کے افکار اور قربانیوں نے آزادی کی تحریک کو نئی توانائی بخشی اور انگریز مخالف جذبہ عوام میں مزید پھیل گیا۔ یہی وہ بیج تھا جس نے بعد کے انقلابات کے لیے زمین ہموار کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا تسلسل تھی۔ انقلابیوں نے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ملک گیر بغاوت کا منصوبہ بنایا لیکن ۱۰ مئی کو میرٹھ کی چھاؤنی میں سپاہیوں نے قبل از وقت بغاوت کر دی اور دہلی پہنچ کر بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس اعلان کے بعد بغاوت پورے شمالی و وسطی ہندوستان میں پھیل گئی، لکھنؤ، کانپور، جھانسی اور گوالیار میں خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ اگرچہ یہ جنگ انگریزوں کی طاقت کے آگے ناکام ہو گئی، لیکن اس نے ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک ہمہ گیر تحریک کی بنیاد رکھ دی جو بالآخر ۱۹۴۷ء میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

حریت پسند علماء اور ان کی قربانیاں

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء برصغیر کی تاریخ کا وہ عظیم باب ہے جس میں بے شمار جانبازوں اور سورماؤں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے وطنِ عزیز کی آزادی کی شمع روشن کرنے کی کوشش کی۔ اس جدوجہد میں علماء اکرام اور مختلف قبائل، سرداروں اور عوام نے قربانیاں دیں، وہیں دوسرے لوگوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اس معرکۂ حریت میں مذہبی وقومی جذبے سے سرشار شخصیات میں مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی، کنور سنگھ، عظیم اللہ خان، نواب محمود خان، نواب عبدالرحمان، نواب عبدالصمد خان اور رسول بخش کاکوری، رانی لکشمی بائی، تاتیا ٹوپے، نانا صاحب، بیگم حضرت محل اور

جنرل بخت خاں جیسے غیر معمولی قائدین پیش پیش تھے۔ ان جانبازوں نے انگریزی استعمار کے خلاف اپنی بہادری اور جانفشانی کے جوہر دکھائے۔

تاریخی شواہد کے مطابق صرف مسلمانوں کے شہید ہونے والوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب تھی، جن میں سے تقریباً اکیاون ہزار پانچ سو کا تعلق صرف علماء کرام سے تھا۔ یہ اعداد و شمار اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ اس عظیم جدوجہد آزادی میں دین دار طبقہ صفِ اوّل میں کھڑا تھا اور ان کے خون کی سرخی نے تحریکِ آزادی کو دوام بخشا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی صرف سیاسی بغاوت نہ تھی بلکہ یہ ایک ہمہ جہت عوامی تحریک تھی، جس میں قائدین، علماء، سردار اور عام لوگ سب نے اپنی اپنی بساط کے مطابق قربانیاں دیں اور ہندوستان کی آزادی کی بنیاد رکھی۔

علماء پر ظلم وستم

مولانا عبد القادر کے پوتے مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کو آزادی کی تحریک میں سرگرم حصہ لینے کی پاداش میں دس برس چھ ماہ کی قید میں رکھا گیا۔ اسی طرح پنجاب کے انبالہ میں ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو مولانا یحییٰ علیم عظیم آبادی، مولوی جعفر تھانوی اور مولانا عبد الرحیم صادق پوری کو عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی، مگر ملک میں انتشار کے خوف سے یہ سزا بدل کر کالا پانی کر دی گئی۔ اورنگ آباد میں علماء کی تحریک پر فدا علی نے بغاوت کی، جبکہ حیدرآباد میں چھڈا خان نے انگریزوں کو للکارا۔ بعد ازاں ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو مولوی علاء الدین اور روہیلا قائد طرہ باز خاں نے مجاہدین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ ریزیڈنسی پر حملہ کیا، لیکن ناکامی کے بعد طرہ باز خاں شہید کر دیے گئے اور ان کی لاش حیدرآباد میں سرِ عام لٹکا دی گئی۔

قیدوبند اور شہادتیں

مولوی علاء الدین کو ۲۸ جون ۱۸۵۹ء کو کالا پانی کی سزا دی گئی۔ اسی طرح

الہ آباد کے مولوی لیاقت علی نے صوبہ سرحد میں حریت پسندی کا چراغ روشن کیا اور سورت میں ایک مرکز قائم کر کے برسوں انقلابی تحریک کی قیادت کی۔ مگر جب یہ انقلاب غداری اور سازش کے باعث کمزور پڑا تو انگریزوں نے بے رحمی اور سفاکی سے علماء کو تہ تیغ کیا۔ محبانِ وطن، بالخصوص وہ علماء جنہوں نے انگریزوں کے خلاف فتوے پر دستخط کیے تھے، دہلی کی جامع مسجد کے سامنے ابلتے تیل کے کڑاہوں میں ڈال کر جلائے گئے، اور بہت سے علما کو گولی مار کر درختوں پر لٹکا دیا گیا۔ انگریز مؤرخ ٹامسن کے مطابق صرف دہلی میں ہی پانچ سو علماء کو شہید کر دیا گیا۔

انگریزوں کا انتقام

اس ظلم کی انتہا اس وقت دیکھی گئی جب ''ٹائمز آف انڈیا'' کی ایک رپورٹ کے مطابق انقلاب کی ناکامی کے بعد زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سی دیا جاتا، پھانسی سے قبل ان کے جسم پر سور کی چربی مل دی جاتی، یا انہیں زندہ آگ میں جھونکا جاتا۔ بعض کو زبردستی بدفعلی پر مجبور کیا گیا تاکہ ان کی روحانی غیرت کو بھی مجروح کیا جا سکے۔ یہ مظالم اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ انگریز نہ صرف جسمانی غلامی چاہتے تھے بلکہ روحانی طور پر بھی ہندوستانیوں کو توڑ دینا چاہتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کا انجام

آخر کار جب بہادر شاہ ظفر پر بغاوت کی قیادت کا مقدمہ چلا تو انہیں ملک بدر کرنے کا حکم سنایا گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر ظلم یہ تھا کہ انگریز افسر ہڈسن نے ان کے بیٹوں مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور پوتے مرزا ابوبکر و مرزا عبیداللہ کو قتل کر کے ان کے کٹے ہوئے سر ایک خوان میں رکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیے۔ بہادر شاہ ظفر نے اس دلخراش منظر پر کمال صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ''الحمدللہ! تیمور کی اولاد اسی طرح سرخرو ہو کر اپنے باپ کے سامنے آتی ہے''۔ (رگھوناتھ سنگھ، غدر کے بعد دہلی، مطبوعہ 1957، ص 178)

لیکن جب انہیں ملک بدری پر رنگون (میانمار) لے جایا گیا تو وطن کی جدائی کا غم سہہ نہ سکے اور ان کے دل سے بے ساختہ یہ شکوہ زبان پر آیا کہ:

کیا بدنصیب ہے ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں!

(ابوالکلام آزاد: ''غبارِ خاطر''، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1946، ص145)

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کا کردار

ہندوستان کو آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے لئے طویل اور صبر آزما جدوجہد سے گزرنا پڑا۔ غیر ملکی انگریز حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے سازشوں اور دھوکہ دہی کے ساتھ رشوت، لالچ اور ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو بڑے پیمانے پر اختیار کیا۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، تاریخ کو مسخ کیا، حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا، بے گناہ ہندوستانیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، گولیاں برسائیں، معصوم انسانوں کو پھانسی پر لٹکایا، یہاں تک کہ چلتی ریل سے لوگوں کو باہر پھینکا۔ لیکن بہادر مجاہدینِ آزادی نے ان سب مظالم کے باوجود ہمت نہ ہاری، قربانیاں دیں اور ملک کو آزاد کر کے دم لیا۔

تحریکِ آزادی میں اگرچہ ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے لیکن مسلمانوں کا کردار نمایاں اور قائدانہ رہا اور ابتدائی پچاس سالوں میں تو صرف مسلمان ہی قربانی دیتے رہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں براہِ راست اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا گیا تھا۔ اس محرومی کا دکھ سب سے زیادہ مسلمانوں کو تھا۔ وہی حکمران سے محکوم بنے، اس لئے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی اصل جدوجہد بھی انہوں نے ہی شروع کی۔ اسی وجہ سے مسلم علماء، مشائخ، مجاہدین اور عوام سب نے آزادی کی اس تحریک میں قیادت اور رہنمائی کا کردار ادا کیا۔

انگریزوں کے خلاف منظم جنگ کی ابتدا (۱۷۵۱ء)

ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف پہلی منظم اور مسلح جنگ کا آغاز ۱۷۵۱ء میں ہوا جب بنگال کے حکمران نواب علی وردی خان (نانا نواب سراج الدولہ) نے انگریزوں کو کلکتہ سے بے دخل کیا۔ اُس وقت انگریزوں کا بڑا مرکز فورٹ ولیم (Fort William) اور

ڈائمنڈ ہاربر (Diamond Harbour) تھا۔علی وردی خان نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کو بھانپ لیا اوران کے قلعے پرحملہ کرکے انہیں بھگا دیا۔انگریز ڈائمنڈ ہاربر میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔یہ واقعہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بڑی مسلح جدوجہد آزادی قرار دیا جاتا ہے۔

علی وردی خان کے بعدان کے نواسے نواب سراج الدولہ تخت نشین ہوئے۔وہ ایک جواں ہمت اور غیور حکمران تھے۔سراج الدولہ نے فوراً اس بات کو محسوس کیا کہ انگریز آہستہ آہستہ تجارت کے بہانے ملک پر قابض ہو رہے ہیں۔انھوں نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کی مختلف تدبیریں اختیار کیں۔لیکن بدقسمتی سے ان کے دربار میں میر جعفر جیسے غدار اور سازشی لوگ موجود تھے۔انہی سازشوں کے نتیجے میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور بالآخر وہ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو تاریخی پلاسی کی جنگ میں شہید کر دیئے گئے۔

جنگِ پلاسی ۱۷۵۷ء اور جنگِ بکسر ۱۷۶۴ء

ہندوستان کی تاریخ میں دو جنگیں انتہائی اہم موڑ ثابت ہوئیں:

۱۔پلاسی کی جنگ (۲۳ جون ۱۷۵۷ء)

یہ جنگ نواب سراج الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان لڑی گئی۔میر جعفر کی غداری اور انگریزوں کی چالاکیوں کے باعث اس جنگ میں نواب کو شکست ہوئی۔اس کے بعد انگریزوں نے بنگال پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

۲۔بکسر کی جنگ (۲۲ اکتوبر ۱۷۶۴ء)

یہ جنگ بنگال کے نواب میر قاسم، اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ شاہ عالم دوم نے مل کر انگریزوں کے خلاف لڑی۔مگر ایک بار پھر سازشوں اور انگریزوں کی فوجی طاقت کے باعث شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس جنگ کے بعد انگریزوں کو نہ صرف بنگال بلکہ بہار اور اڑیسہ پر بھی مکمل اختیار حاصل ہو گیا۔یہی وہ موڑ تھا جہاں سے ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کا کردار

دکن کا علاقہ اس زمانے میں طاقت اور سیاست کا مرکز تھا۔ یہاں کے فرمانروا حیدرعلی (وفات ۱۷۸۲ء) ایک نہایت بہادر، مدبر اور جنگی تدابیر میں ماہر حکمران تھے۔ انہوں نے اپنی دوراندیشی سے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو سختی سے روکا اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک انگریزوں کے لیے مستقل خطرہ بنے رہے۔ حیدرعلی کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے ٹیپو سلطان تختِ میسور پر متمکن ہوئے۔ ٹیپو سلطان بچپن ہی سے شجاعت اور غیرت کے پیکر تھے۔ وہ صرف ایک بادشاہ نہیں بلکہ ایک عظیم مجاہد، مصلح اور آزادی کے اولین سپاہی تھے۔

۱۷۸۳ء میں ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف پہلی باقاعدہ جنگ لڑی جسے تاریخ میں میسور کی دوسری جنگ کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ ۱۷۸۴ء تک جاری رہی اور نتیجہ انگریزوں کی شکست پر نکلا۔ انگریز اس شکست کو کبھی فراموش نہ کرسکے اور انتقام لینے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگے۔ ٹیپو سلطان نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے، معیشت کو مستحکم کرنے اور فوجی طاقت کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے توپ خانے کو جدید بنایا، فرانسیسی ماہرین کو فوجی تربیت کے لیے مدعو کیا اور یہاں تک کہ راکٹ ٹیکنالوجی ایجاد کرکے دشمن کے دلوں میں خوف پیدا کردیا۔

لیکن انگریز باز نہ آئے۔ ۱۷۹۲ء میں انہوں نے میسور پر دوبارہ حملہ کیا۔ ٹیپو سلطان نے دلیرانہ مقابلہ کیا مگر بدقسمتی سے اپنے بعض وزراء اور افسروں کی غداری، فوج کے اندرونی اختلافات اور دشمن کی اچانک یلغار کے باعث انہیں پسپا ہونا پڑا۔ آخرکار ٹیپو سلطان کو ایک صلح نامے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا، جس کی شرائط نہایت سخت تھیں۔ معاہدے کے تحت انہیں تین کروڑ روپے تاوان کے طور پر ادا کرنے پڑے، آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کرنی پڑی اور اپنے دو نوعمر شہزادوں کو یرغمال کے طور پر انگریزوں

کے سپرد کرنا پڑا۔

یہ صلح وقتی طور پر انگریزوں کے لیے فتح تھی مگر ٹیپو سلطان کے دل میں آزادی کی تڑپ اور غیرت کی آگ پہلے سے زیادہ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے کہا تھا: ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے''۔

(History of Mysore, Vol. 3 Page 334, C. Hayavadano Rao)

ٹیپو سلطان کی یہ جرات، انگریزوں کی غلامی کو قبول نہ کرنا اور آخری دم تک مزاحمت کرنا دراصل ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے روشن ابواب میں سے ایک ہے۔

ٹیپو سلطان کی آخری جنگ اور شہادت (۱۷۹۹ء)

ٹیپو سلطان نے زندگی بھر انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی اور ہمیشہ آزادی کو غلامی پر ترجیح دی۔ انہوں نے ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سلطانِ ترکی سلیم عثمانی، دیگر مسلمان بادشاہوں اور ہندوستان کے امراء و نوابوں سے خط و کتابت کی۔ ٹیپو سلطان دن رات انگریزوں کے مقابلے میں سرگرم رہے اور سخت معرکہ آرائی کرتے رہے۔ قریب تھا کہ انگریزوں کے تمام منصوبے ناکام ہو جاتے اور وہ ہندوستان سے نکال باہر کیے جاتے، لیکن انگریزوں نے جنوبی ہند کے امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا اور یوں ٹیپو سلطان تنہا رہ گئے۔ آخر کار انہوں نے سرنگا پٹم کے معرکے میں جامِ شہادت نوش کیا اور ہمیشہ کے لیے تاریخ میں امر ہو گئے۔ انہوں نے غلامی اور انگریزوں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے کے بجائے موت کو ترجیح دی۔

۱۷۹۲ء کے معاہدے کے بعد بھی ٹیپو سلطان کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ انہوں نے دوبارہ اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ یورپ کی سیاسی تبدیلیوں پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ جانتے تھے کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کو صرف طاقت

کے ذریعے روکا جاسکتا ہے۔ اسی مقصد سے انہوں نے فرانس سے تعلقات بڑھائے، جدید اسلحہ منگوایا اور اپنی فوج کو نئے انداز میں منظم کیا۔ انگریز اس صورتحال سے سخت پریشان تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ٹیپو سلطان زیادہ عرصہ زندہ رہے تو پورے برصغیر میں ان کے خلاف بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوں گی۔

بالآخر ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے چوتھی جنگِ میسور چھیڑ دی۔ اس بار ان کے ساتھ نظامِ حیدرآباد اور مرہٹوں نے بھی غداری کرتے ہوئے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یوں ٹیپو سلطان کو چاروں طرف سے دشمنوں نے گھیر لیا۔ سرنگاپٹم (سلطنتِ میسور کا دارالحکومت) کا سخت محاصرہ کیا گیا۔ ٹیپو سلطان دن رات محاذ پر موجود رہتے اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ مل کر لڑتے۔ بالآخر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو انگریزوں نے قلعے پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ ٹیپو سلطان نے اپنی تلوار لہراتے ہوئے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور آخری سانس تک لڑتے رہے۔ ان کے جسم پر گولیوں اور تلواروں کے بے شمار زخم آئے لیکن انہوں نے پسپائی قبول نہ کی اور شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہو گئے۔

جب انگریز جنرل ہیرس (General Harris) کو ٹیپو سلطان کی شہادت کی خبر ملی تو اس نے ان کی لاش کے قریب کھڑے ہو کر کہا: ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے''۔

(History of Tipu Sultan, the world press, 1951, page 382)

اس طرح ایک عظیم مجاہد اور بہادر حکمران ختم ہو گیا، لیکن ان کی قربانی نے آنے والی نسلوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی۔ ٹیپو سلطان کی شہادت نے یہ پیغام دیا کہ آزادی کی قیمت صرف خون سے ادا کی جاسکتی ہے، اور غلامی کی زندگی سے عزت کی موت ہزار درجے بہتر ہے۔

جنگِ آزادی میں شاہ ولی اللہؒ اور ان کے شاگردوں کا کردار

ٹیپو سلطان کی شہادت (۱۷۹۹ء) اور ہزاروں افراد کے قتل و غارت کے بعد

ہندوستان میں انگریزوں کی سیاسی اور فوجی گرفت تیزی سے مضبوط ہوتی گئی۔ ایک طرف انگریز سلطنت کے مختلف حصوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہورہے تھے، تو دوسری جانب وہ اپنے ساتھ عیسائی مشنری سرگرمیاں بھی بڑھا رہے تھے تاکہ ہندوستان کے مذہبی اور تہذیبی ڈھانچے کو کمزور کیا جاسکے۔ مدارس، خانقاہیں اور دینی ادارے بڑی تعداد میں تباہ کیے گئے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی علمی و دینی زندگی شدید متاثر ہوئی۔ ایسے حالات میں دہلی میں ایک نئی دینی اور فکری تحریک نے جنم لیا۔ اس تحریک کی فکری بنیاد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳ء سے ۱۷۶۲ء تک) نے اپنے زمانے میں رکھی تھی، جنہوں نے قرآن کا فارسی ترجمہ اور اصلاحی و انقلابی تصانیف لکھ کر مسلمانوں کو دین کی اصل تعلیمات اور اتحاد و عدل کا پیغام دیا۔

شاہ ولی اللہؒ کی وفات 1762ء کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ۱۷۴۶ء تا ۱۸۲۴ء نے اس مشن کو سنبھالا اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کے خلاف فکری و سیاسی رہنمائی فراہم کی۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم اور مجتہد سمجھے جاتے تھے۔ ان کی تحریک ہی آگے چل کر سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسے مجاہدین کے ذریعے ایک عملی جہاد کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

۱۸۰۳ء کا تاریخی فتویٰ

جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کیا اور مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو صرف ایک علامتی حکمران بنا کر رکھ دیا تو اس وقت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے ایک عظیم تاریخی قدم اٹھایا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ چونکہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کی سیاسی بالادستی ختم ہوچکی ہے اور انگریز عملی طور پر حاکم بن گئے ہیں، اس لیے یہ ملک ''دارالاسلام'' نہیں رہا بلکہ ''دارالحرب'' ہے۔

یہ فتویٰ نہ صرف ایک مذہبی اعلان تھا بلکہ ایک انقلابی منشور کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس کے ذریعے شاہ عبدالعزیزؒ نے پوری امتِ مسلمہ کو بیدار کرنے اور انگریزوں کے خلاف منظم جدوجہد کی راہ ہموار کی۔ اسی فتویٰ کے نتیجے میں برصغیر کے علماء، طلبہ اور مجاہدین نے آزادی کی تحریک کو نئی جان بخشی۔

سید احمد شہیدؒ اور تحریکِ جہاد کی عملی جدوجہد

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتویٰ کے بعد سب سے نمایاں شخصیت سید احمد شہید بریلویؒ (۱۷۸۶ء تا ۱۸۳۱ء) کی تھی۔ آپ نے فوجی تربیت حاصل کی اور دل و جان سے جہاد کے داعی بن گئے۔ دہلی کے علماء نے آپ کو تحریکِ جہاد کا قائد مقرر کیا۔ ان کے ساتھ ان کے رفیقِ خاص شاہ اسماعیل شہید دہلویؒ (۱۷۷۹ء تا ۱۸۳۱ء) بھی تھے جو شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے تھے۔ یہ دونوں شخصیات نہ صرف علمی اور روحانی میدان کے رہنما تھے بلکہ عملی طور پر بھی ایک منظم مجاہدانہ تحریک لے کر اٹھے۔

تبلیغ اور عوامی بیداری

۱۸۲۶ء سے سید احمد شہیدؒ نے پورے ہندوستان میں سفر شروع کیا۔ انہوں نے بنگال، بہار، اودھ، پنجاب اور سندھ تک عوام کو دین کی اصل روح، اصلاحِ معاشرہ اور جہاد کی دعوت دی۔ ہزاروں افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئے۔ یہ تحریک نہ صرف عسکری بلکہ ایک اصلاحی اور دینی انقلاب کی تحریک تھی جس نے عام مسلمانوں کے دلوں میں انگریز اور سکھ ظلم کے خلاف نفرت پیدا کی۔

سرحدی علاقہ اور مجاہدین کا مرکز

۱۸۲۶ء کے بعد سید احمد شہیدؒ نے اپنے مجاہدین کو شمالی سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کی طرف روانہ کیا تاکہ یہاں ایک مضبوط مرکز قائم کر کے جہاد کا آغاز کیا جا سکے۔ یہاں انہوں نے خالصتہً اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی اور پٹھان قبائل کو ساتھ ملا

کر جہاد کا پرچم بلند کیا۔

بالاکوٹ کی جنگ

آخرکار سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کا نقطۂ عروج بالاکوٹ کی جنگ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) تھی۔ سکھوں کی طاقتور فوج کے خلاف یہ معرکہ لڑا گیا۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے نہایت شجاعت کے ساتھ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ اگرچہ یہ جنگ عسکری اعتبار سے شکست پر منتج ہوئی، لیکن اس نے برصغیر کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولا۔

یہ قربانی محض ایک جنگ کی نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک کی علامت تھی جس نے آگے چل کر ہزاروں علماء، مجاہدین اور عوام کے دلوں میں آزادی کا شعلہ روشن رکھا۔ دراصل یہی تحریک بعد میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور پھر برصغیر کی حتمی آزادی ۱۹۴۷ء کی فکری بنیاد بنی۔

اس طرح شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی وفکری تحریک، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا تاریخی فتویٰ، اور ان کے شاگرد سید احمد شہیدؒ و شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عملی جدوجہد، سب مل کر ہندوستان میں آزادی کی تحریک کی وہ پہلی لہریں ہیں جنھوں نے انگریزوں کے اقتدار کے خلاف ایک مسلسل بغاوت کی بنیاد رکھی۔ یہ کہنا بجا ہے کہ اگر ٹیپو سلطان اور حیدر علی نے انگریزوں کو میدانِ جنگ میں روکا تو شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے فکر و ایمان کی طاقت سے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔

۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۷ء تک کی قیادت

سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد بھی جہاد کی شمع بجھی نہیں بلکہ اس کے پروانے برابر سرگرم رہے۔ ان کے بعد مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ اور ان کے بھائی مولانا عنایت علی عظیم آبادیؒ نے قیادت سنبھالی۔ ۱۸۵۲ء میں مولانا ولایت علیؒ اور

پھر ۱۸۵۸ء تک مولانا عنایت علیؒ نے اس تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے انتھک محنت کی۔ اس طرح یہ قافلہ رواں دواں رہا اور بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک پہنچ گیا۔

انگریزوں نے علماء کی اس جہادی تحریک کو عموماً "وہابی تحریک" کا نام دیا اور اسے نجد کے محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے جوڑنے کی کوشش کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی یہ تحریک دراصل شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادے کی فکری و اصلاحی کوششوں کا تسلسل تھی۔ اس کے اکثر رہنما شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے شاگرد یا تربیت یافتہ تھے۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ یہ اصل میں ولی اللہی تحریک تھی، جس نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ بیدار رکھی۔

جہانگیر اور اس کے بعد شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد میں انگریز تجارت کے بہانے جڑ پکڑتے گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ محض تجارت نہیں بلکہ بتدریج سیاسی اثر ورسوخ حاصل کرنے آئے تھے۔ لیکن مغل سلاطین نے اس پہلو پر زیادہ غور نہ کیا اور انہیں سہولتیں دیتے رہے۔

اقتدار کی بنیاد

سترھویں صدی کے آخر تک انگریز ہندوستان کے مختلف ساحلی علاقوں جیسے سورت، بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں اپنے قدم مضبوط کر چکے تھے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب مغلیہ سلطنت کمزور ہونا شروع ہوئی تو انگریزوں نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں فوجی مداخلت شروع کی اور مقامی حکمرانوں کو اپنے زیر اثر لے لیا۔

انگریزوں کی اصل سیاسی طاقت کی بنیاد ۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی سے پڑی، جب انہوں نے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ۱۷۶۴ء کی جنگِ بکسر میں بھی انہوں نے اپنی برتری ثابت کی اور رفتہ رفتہ پورے ہندوستان میں اپنا

اقتدار پھیلا لیا۔ یوں سترھویں صدی کے آغاز میں جولوگ محض تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز تک پورے ملک کے حکمران بن بیٹھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف علماء اور مجاہدین کی ولی اللہی تحریک آزادی کا علم بلند کررہی تھی، تو دوسری طرف انگریز بتدریج تجارتی رشتوں کو سیاسی اقتدار میں بدل کر ہندوستان پر اپنی حکمرانی قائم کررہے تھے۔

علماء کی تاریخی میٹنگ

۱۸۵۶ء میں دہلی کے علاقے میں پورے ہندوستان کے بڑے بڑے علما کی ایک تاریخی میٹنگ منعقد ہوئی، جس میں اس وقت کے نامور اہلِ علم وزہد شامل ہوئے۔ ان میں مولانا جعفر تھانسیریؒ، مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ، مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، اور حافظ ضامن شہیدؒ جیسے جلیل القدر علماء شریک تھے۔ اس میٹنگ کا مقصد انگریز سامراج کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنا اور عوام میں بیداری پیدا کرنا تھا۔

جب تمام علما بیٹھے تو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بڑے درد وسوز کے ساتھ فرمایا:

''کیا تمہیں یہ احساس نہیں کہ انگریز ہمارے سروں پر مسلط ہو چکا ہے؟ اس نے پورے ہندوستان میں اپنی حکومت کا جال پھیلا دیا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم فیصلہ کن لڑائی کے لیے تیار ہوں۔ یا تو ہم شہادت قبول کریں گے یا انگریز کے ناپاک قدموں کو اس دھرتی سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ انگریز کو یہاں رہنے نہیں دیا جائے گا''۔

مولانا نانوتویؒ کی یہ پرجوش تقریر سن کر مجمع میں ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا:

''حضرت! ہماری تعداد تو بہت تھوڑی ہے، ہمارے وسائل بھی محدود ہیں، ہم انگریز کی طاقت کا مقابلہ کیسے کرسکیں گے؟'' اس موقع پر مولانا نانوتویؒ نے ایک تاریخی جملہ فرمایا جس نے سب کے دلوں میں آگ لگا دی:

''کیا ہماری تعداد غازیانِ بدر سے بھی کم ہے؟''۔(تاریخ دیوبند،ص95)

یہ بات کہنا تھا کہ مجمع میں جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی۔سب کے دلوں میں شہادت اور آزادی کا جذبہ بھر گیا۔یہ جملہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔شیخ اکرام نے اپنی معروف کتاب موجِ کوثر میں لکھا ہے کہ یہ وہ لمحہ تھا جس نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی۔

اس میٹنگ کے بعد علماء نے عہد کیا کہ وہ اپنی جان، مال اور علم سب کچھ دینِ حق اور آزادیٔ وطن کے لیے قربان کر دیں گے۔یہی وہ دینی وملی جذبہ تھا جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے لیے فکری اور روحانی بنیاد فراہم کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور علماء کا عملی کردار

یہی میٹنگ آگے چل کر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا نقطۂ آغاز بنی۔جب ہندوستان میں بغاوت کی آگ بھڑکی تو انہی علما نے قیادت سنبھالی اور ہر محاذ پر عملی کردار ادا کیا۔

شاملی کی لڑائی (۱۸۵۷ء)

شاملی کے میدان میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو امیرِ لشکر منتخب کیا گیا۔مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان کے شانہ بشانہ لڑائی میں حصہ لیا۔اگرچہ وسائل کم اور دشمن طاقتور تھا، لیکن مجاہدین نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔یہ معرکہ مسلمانوں کی قربانیوں اور عزم کی علامت بن گیا۔

اس جنگ میں حافظ ضامن شہیدؒ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔وہ شاملی کی لڑائی میں شجاعت سے لڑے اور شہید ہو گئے۔ان کی شہادت نے تحریکِ آزادی کو مزید قوت بخشی۔

حضرت مولانا جعفر تھانسیریؒ نے انگریزوں کے خلاف زبردست جدوجہد کی اور عوام کو جہاد کے لیے ابھارا۔گرفتار ہونے کے بعد انگریزوں نے انہیں سخت سزائیں

دیں لیکن وہ اپنے مشن سے پیچھے نہ ہٹے۔

دہلی اور دیگر مقامات

مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ اور دوسرے علما نے دہلی، لکھنؤ اور دیگر علاقوں میں بغاوت کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے عوام میں بیداری پیدا کی اور انگریز کے خلاف مسلح اور فکری دونوں محاذوں پر جدوجہد کی۔

اس طرح ۱۸۵۶ء کی علما کی میٹنگ صرف ایک اجتماع نہ تھا بلکہ ایک ایسی تحریک کا نقطۂ آغاز تھا جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو جنم دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس جدوجہد کے پیچھے اصل روح علما ہی کی تھی، جنہوں نے نہ صرف قوم کی رہنمائی کی بلکہ خود میدانِ جنگ میں اُتر کر جانیں قربان کیں۔ ان کا یہ کردار تاریخِ ہند میں سنہری حروف سے لکھا گیا ہے۔

غدر یا آزادی کی لڑائی ۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء کی جنگ کو برصغیر کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن اور عظیم موڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان کے ایک طبقے نے اسے ''غدر'' کہا، مگر حقیقت میں یہ صرف بغاوت نہیں بلکہ آزادی کی ایک عظیم اور مقدس جنگ تھی۔ ''غدر'' کا لفظ وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو انگریزی ذہنیت کے حامل تھے، جبکہ درحقیقت اس تحریک کی قیادت وہ علماء اور مجاہدین کر رہے تھے جنہوں نے اپنی جانیں قربان کر کے غلام ہندوستان کو آزادی کی راہ دکھائی۔ یہ وہی تحریک تھی جس کے روحِ رواں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔ علماء نے اعلان کیا کہ یہ لڑائی محض اقتدار کی جنگ نہیں بلکہ ایک مذہبی و قومی فریضہ ہے، اس لیے اس کو ''غدر'' کہنا ان کی قربانیوں کی توہین ہے۔

اس جنگِ آزادی میں علماء نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ مولانا جعفر تھانیسریؒ کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ مولانا یحییٰ علیؒ کی داڑھی کے بال کاٹے گئے اور انھیں بھی پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ مولانا جعفر تھانیسریؒ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ

ہمیں انبالہ کی جیل سے لاہور لایا گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں اور جسم لہولہان تھا۔ ہمیں لوہے کے پنجروں میں قید کیا گیا، ایسے پنجروں میں جن میں نہ بیٹھا جا سکتا تھا اور نہ ٹیک لگائی جا سکتی تھی۔ ان پنجروں کو ریل گاڑی کے ڈبوں میں رکھ کر ملتان بھیجا گیا۔ تین ماہ تک یہ قافلہ کہیں دس دن اور کہیں مہینوں رکا رہا۔ بالآخر ملتان پہنچنے کے بعد بتایا گیا کہ صبح پھانسی دی جائے گی۔ مولانا تھانیسری لکھتے ہیں کہ اس رات ہم نے خوشی کے ساتھ عبادت و مناجات کی اور کہا کہ ہم گناہگار ہیں، اگر بستر پر موت آتی تو شاید بخشش نہ ہوتی، اب شہادت کی موت نصیب ہوگی اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوضِ کوثر پر حاضر ہوں گے۔

لیکن انگریز بھی اپنے ظلم میں مکار تھے۔ پھانسی کی بجائے مولانا جعفر تھانیسری اور ان کے ساتھیوں کو ''کالا پانی'' کی سزا دی گئی۔ یعنی جیلِ انڈمان روانہ کر دیا گیا، جہاں موت سے بھی سخت تر زندگی ان کا مقدر بنائی گئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی قربانیوں کا عالم یہ تھا کہ انگریز مؤرخ ہنری ہیڈ نے خود لکھا کہ ''یہ ایک اسلامی بغاوت تھی''۔ ''قیصر التواریخ'' کے مطابق اس جنگ میں ستائیس ہزار مسلمانوں کو سزائے موت دی گئی اور سات دن تک مسلسل قتلِ عام جاری رہا۔

ہنری میڈ نے بھی لکھا: ''غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصل محرک ہندو نہیں تھے، بلکہ یہ مسلمانوں کی سازش اور قیادت کا نتیجہ تھا''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی دراصل مسلمانوں کی قربانیوں اور علماء کی قیادت کی دین تھی، جسے تاریخ نے ہمیشہ یاد رکھا ہے۔

> "It must not be forgotten that the leaders and principal instigators of the outbreak were not the Hindus but the Mohammedans. The conspiracy owed its origin and organization mainly to them".

(The Sepoy Revolt: its Causes and Consequences, 1857, Page 56, by Henry Mead, London)

۱۸۵۷ء میں علماء کی بغاوت

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی دراصل ایک ایسا تاریخی موڑ تھا جس نے ہندوستان کی سرزمین پر انگریزوں کے خلاف مزاحمت کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا۔ یہ محض ایک وقتی ہنگامہ یا فوجی بغاوت نہ تھی بلکہ برسوں کی فکری اور علمی محنت کا نتیجہ تھی۔ خصوصاً شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور شاہ اسحاق محدث دہلویؒ کی علمی و دینی تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک زندہ شعور بیدار کیا۔ ان بزرگوں نے غلامی کے خلاف فکری بنیادیں فراہم کیں، دین کی اصل روح کو اجاگر کیا اور امت کو بیداری کی دعوت دی۔ یہی بیداری آگے چل کر علما اور عوام کی مشترکہ جدوجہد کی صورت میں سامنے آئی۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے مظالم بڑھنے لگے اور سیاسی، مذہبی و معاشرتی آزادی پر ضرب لگائی جانے لگی تو علماء کرام نے اس کے خلاف قیادت سنبھالی۔ یہ وہ جماعت تھی جو صرف مدرسوں کے حجرے یا خانقاہوں کی خلوت تک محدود نہ رہی بلکہ میدانِ عمل میں نکلی اور عملی جہاد کے ذریعے انگریز سامراج کو للکارا۔ ان نامور شخصیات میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا فضلِ حق خیرآبادیؒ، مولانا سرفرازؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حافظ ضامن شہیدؒ اور مولانا منیر نانوتویؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے اپنے قلم سے بھی جدوجہد کی اور میدانِ قتال میں بھی پیش پیش رہے۔

ان علماء کی بغاوت محض جذبات کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ یہ ایک منظم اور فکری تحریک تھی جس نے قوم کو بیدار کیا۔ انہوں نے عوام کو سمجھایا کہ غلامی کی زندگی سے بہتر ہے کہ آزادی کے لیے قربانی دی جائے۔ یہ وہی جماعت تھی جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کو ''غدر'' نہیں بلکہ ''تحریکِ آزادی'' کا عنوان دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی قیادت اور قربانیوں نے یہ واضح کر دیا کہ یہ جنگ محض اقتدار یا سیاست کی جنگ نہ تھی بلکہ دین و ایمان، عزت و وقار اور

آزادی کی جنگ تھی۔ان بزرگوں کی محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں آزادی کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے آگے چل کر پورے برصغیر کی تقدیر بدل دی۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں علماء دیوبند کا کردار

ہندوستان کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء محض ایک فوجی بغاوت نہ تھی بلکہ یہ ایک عظیم عوامی اور دینی تحریک تھی۔اس تحریک میں علمائے دیوبند کا کردار تاریخ کے روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ان علماء نے نہ صرف انگریز سامراج کے خلاف میدانِ جنگ میں قیادت سنبھالی بلکہ اپنی علمی اور دینی بصیرت سے قوم کو بیدار بھی کیا۔

شاملی کی جنگ اور علماء کی قیادت

۱۸۵۷ء کی تحریک میں ضلع مظفر نگر (شاملی) کے میدان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔یہاں علماء دیوبند نے انگریز فوج کے مقابلے میں باقاعدہ جنگ کی قیادت سنبھالی۔ اس معرکے کے امیر مجاہد کبیر حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تھے،جبکہ عملی قیادت میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ،مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا منیر نانوتوی صفِ اول میں موجود تھے۔اس جنگ میں حافظ ضامن شہید نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو جنگ کے دوران انگریز فوج کی گولی بھی لگی اور وہ زخمی ہوئے، تاہم زندہ بچ گئے۔انگریز حکومت نے آپ کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کیا،مگر وہ گرفتاری سے بچ نکلے اور خفیہ طور پر دینی و علمی خدمات انجام دیتے رہے۔آپ نے بعد میں دارالعلوم دیوبند (۱۸۶۶ء) قائم کیا، جو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک فکری و دینی قلعہ ثابت ہوا۔بالآخر آپ ۱۸۸۰ء میں وفات پا گئے اور دیوبند کے قبرستان قاسمی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

ہجرتِ مکہ اور روحانی قیادت

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے حالات کا گہرا مشاہدہ کرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس

وقت ملک میں رہ کر تحریکِ آزادی کو قائم رکھنا دشوار ہے۔ چنانچہ آپ نے مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت اختیار کی اور وہیں سے اپنے مریدین و متوسلین کے ذریعے ہندوستان میں رہنمائی اور فیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کی زندگی کا آخری وقت مکہ ہی میں گزرا اور ۱۸۹۹ء میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کو جنت المعلیٰ میں دفن کیا گیا۔

فتوے اور عدالتی مقدمات

اس زمانے میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ مرتب کیا جس پر دہلی کے سینکڑوں علما نے دستخط کیے۔ یہی فتویٰ ان کی گرفتاری کا سبب بنا۔ جب آپ پر عدالت میں مقدمہ چلا اور قاضی نے فتویٰ کی تصدیق چاہی تو مولانا نے مردانہ وار اعلان کیا: ''یہ فتویٰ میرا ہی مرتب کردہ ہے''۔ یہ جرات و استقلال آپ کے کردار کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

علماء کی جلاوطنی اور قربانیاں

۱۸۵۷ء کی جنگ میں مولانا احمد اللہ شاہؒ سپہ سالار کی حیثیت سے سرگرم رہے۔ ایک انگریز مؤرخ R.T. Holmes نے اپنی کتاب (A History of the Indian Mutiny and of the Disturbances which Accompanied it) میں لکھتا ہے: ''مولوی احمد اللہ شاہ شمالی ہند میں انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن تھا''۔

> " The British commander felt that Maulvi Ahmadullah Shah was the bitterest enemy of the British during the Revolt of 1857."

جنگِ آزادی کے بعد ہزاروں علماء کو قید و بند اور جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۶۵ء میں مولانا احمد اللہ عظیم آبادیؒ، مولانا یحییٰ علیؒ، مولانا عبد الرحیم صادق پوریؒ اور مولانا جعفر تھانیسریؒ کو انڈمان جزائر (کالا پانی) بھیج دیا گیا۔ اسی زمانے میں مولانا فضلِ حق خیرآبادیؒ،

مفتی احمد کاکورویؒ اور مفتی مظہر کریم دریابادیؒ کو بھی قید وجلا وطنی کی سزا دی گئی۔

مولانا فضلِ حق خیر آبادیؒ نے انڈمان کی سخت جلاوطنی میں ہی وفات پائی، اسی طرح مولانا احمد اللہ عظیم آبادیؒ اور مولانا یحییٰ علیؒ بھی وہیں دارِفانی سے رخصت ہوئے۔ البتہ مولانا جعفر تھانیسریؒ اور مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ نے اللہ کے فضل سے اٹھارہ سال قید و مشقت برداشت کرنے کے بعد ۱۸۸۳ء میں رہائی پائی اور اپنے وطن واپس آئے۔

۱۸۶۵ء سے ۱۸۸۳ء تک علماء کی آزمائش

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے خصوصاً علماء کرام کو نشانہ بنایا۔ ہزاروں افراد کو سرِعام پھانسی دی گئی اور بے شمار کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں علماء کی ایک بڑی تعداد کو انڈمان کے دور افتادہ جزیرے میں جلاوطنی اور سخت مشقت کی سزائیں دی گئیں۔ یہ مقام ''کالا پانی'' کے نام سے مشہور ہوا، جہاں قیدیوں کو ایسی کٹھن زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا جو موت سے بھی بدتر سمجھی جاتی تھی۔ مولانا جعفر تھانیسریؒ نے اسی قید و بند کی زندگی کا آنکھوں دیکھا حال اپنی مشہور کتاب ''کالا پانی'' میں قلم بند کیا، جس میں انہوں نے نہ صرف اپنی ذاتی تکالیف بیان کیں بلکہ ان گنت بے گناہ مجاہدین کی داستانِ قربانی کو بھی محفوظ کیا۔

اسی عرصے میں دیگر علماء نے بھی سخت ترین اذیتیں برداشت کیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو گرفتار کر کے پہلے سہارنپور کے قید خانے میں رکھا گیا، پھر کچھ مدت کال کوٹھری میں گزارنے کے بعد مظفر نگر منتقل کیا گیا، جہاں انہوں نے چھ ماہ تک قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں۔ اگرچہ انگریز انہیں جنگِ آزادی میں سرگرم کردار ادا کرنے کے الزام میں سزا دینا چاہتے تھے، لیکن اللہ نے انہیں محفوظ رکھا اور وہ بعد میں رہا ہو گئے۔ ان کی حیاتِ مبارکہ جہدِ مسلسل اور دین کی خدمت میں گزری اور بالآخر ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔ آج ان کا مزار گنگوہ کی سرزمین پر مرجعِ خلائق ہے۔

اسی طرح مولانا احمد اللہ عظیم آبادیؒ، مولانا یحییٰ علیؒ، مولانا فضلِ حق خیر آبادیؒ، مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ اور دیگر اکابرین کو بھی انڈمان کی قید میں ڈال دیا گیا۔ ان میں سے اکثر وہیں انتقال کر گئے اور چند ایک ہی طویل اسیری کے بعد اپنے وطن واپس آسکے۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ اور مولانا جعفر تھانیسریؒ تقریباً اٹھارہ سال کی قیدِ بامشقت کے بعد بالآخر ۱۸۸۳ء میں اپنے وطن لوٹے۔ ان کی یہ قربانیاں اور استقامت تاریخِ ہند میں سنہری حروف سے لکھی جانے کے قابل ہیں۔ یہ دور دراصل اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ آزادی کی شمع کو روشن رکھنے کے لیے علما نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور قید و بند، جلاوطنی اور شہادت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔

۱۸۵۷ء کی فتح

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بظاہر مسلمانوں اور اہلِ ہند کی شکست پر منتج ہوئی، لیکن دراصل یہ شکست ایک عظیم فتح کا پیش خیمہ تھی۔ اس جنگ کے بعد اگرچہ ہزاروں مجاہدین شہید ہوئے، بے شمار علما پھانسی پر لٹکائے گئے اور کئی قافلے انڈمان کے قید خانوں میں بھیج دیے گئے، مگر اس جدوجہد نے اہلِ ایمان کے دلوں میں حریت و آزادی کی ایسی آگ بھڑکا دی جو کبھی بجھ نہ سکی۔ یہی وہ جنگ تھی جس نے ہند کے مسلمانوں کو غلامی کے اصل چہرے سے روشناس کرایا اور انہیں اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اسلام کی بقا اور ملت کی عزت صرف جہاد، قربانی اور صبر سے ممکن ہے۔

انگریزوں نے اس ناکامی کے بعد مسلمانوں کو تہہ و بالا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اسلام کے عقائد، افکار اور تہذیب کو ہندوستان سے جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتے تھے۔ انہی دنوں لارڈ میکالے کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا جس نے مغربی تہذیب، نصرانی فکر اور استعماری عزائم کو پھیلانے کا ایک منظم پروگرام بنایا۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہا تھا: ’’میں ایسا نظامِ تعلیم وضع کروں گا جس کے نتیجے میں ایک ہندوستانی مسلمان کا جسم تو کالا ہوگا

لیکن اس کا دماغ انگریز کی طرح سوچے گا‘‘۔ یہی وہ لمحہ تھا جب برطانیہ نے اپنے زوال کی بنیاد خود رکھ دی، کیونکہ وہ جسموں کو تو غلام بنا سکتا تھا مگر دلوں اور روحوں کو کبھی نہیں خرید سکا۔

“ We must at present do our best to form a class who may be interpreters between us and the millions whom we govern a class of persons Indian in blood and colour, but English in taste, in opinions, in morals, and in intellect)”: (Minute on Indian Education, 2 February 1835, by Lord Thamas Babington Macaulay)

چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی فکری وتہذیبی شناخت کی حفاظت کے لیے نئی راہیں نکالیں۔ دیوبند کی درسگاہ اسی جذبۂ حریت کی پیداوار تھی، جہاں غلامی کے اندھیروں میں آزادی کی شمع روشن کی گئی۔ علما نے قرآن وسنت کی روشنی میں نئی نسل کو تیار کیا اور یہ پیغام دیا کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب اور زندہ قوت ہے جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ یوں ۱۸۵۷ء کی یہ جنگ اگرچہ عسکری میدان میں شکست تھی، لیکن فکری و روحانی میدان میں مسلمانوں کی ایک ایسی فتح تھی جس نے آنے والی نسلوں کو بیداری، خودی اور آزادی کی لَو عطا کی۔

۱۸۵۷ء کی فتح اور بعد کی تعلیمی وفکری تحریکات

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بظاہر عسکری میدان میں ہند کے مسلمانوں اور اہلِ وطن کے لیے ناکامی پر ختم ہوئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ناکامی ایک عظیم تر فکری اور روحانی فتح کا آغاز تھی۔ شہادتوں، جلاوطنیوں اور قید و بند کے صعوبت خانوں سے گزرنے کے بعد مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی جو چنگاری بھڑکی تھی، وہ کبھی بجھ نہ سکی۔ یہ جنگ مسلمانوں کو غلامی کی اصل حقیقت سمجھانے والی تھی، اور یہی شعور ان کے مستقبل کے کارناموں کی بنیاد بنا۔

انگریزوں نے شکست کے بعد اپنے قبضے کو مستحکم کرنے کے لیے صرف تلوار کا سہارا نہیں لیا، بلکہ ذہنوں کو غلام بنانے کی مہم شروع کی۔ لارڈ میکالے کے تعلیمی منصوبے نے مغربی تہذیب، نصرانی افکار اور استعماری سوچ کو پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ مگر مسلمانوں کے علما اور اہلِ فکر نے اس چیلنج کو قبول کیا اور نئی فکری و تعلیمی تحریکات کے ذریعے اپنی تہذیب و دین کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ اسی پس منظر میں تین بڑی علمی و تعلیمی تحریکات نے جنم لیا:

۱۔ دار العلوم دیوبند ۱۸۶۶ء

یہ ادارہ سید محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے علما کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ یہاں مقصد صرف علومِ دینیہ کی تدریس نہ تھا بلکہ غلامی کے اندھیروں میں اسلامی تہذیب کی شمع روشن کرنا تھا۔ دیوبند نے ایسی نسل تیار کی جس نے ایمان، قربانی اور صبر کا عملی نمونہ پیش کیا۔

علی گڑھ تحریک ۱۸۷۵ء

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنے کی جدوجہد کی۔ ان کا مقصد تھا کہ مسلمان انگریزی زبان اور مغربی سائنس و ٹیکنالوجی سے آگاہ ہوں تاکہ وہ جدید دنیا میں پیچھے نہ رہیں۔ اگرچہ اس تحریک پر مختلف زاویوں سے تنقید بھی کی گئی، لیکن اس نے مسلمانوں کو علمی و سائنسی میدان میں بیداری بخشی۔

ندوۃ العلماء لکھنو ۱۸۹۴ء

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی نے برصغیر کے مسلمانوں کو شدید سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی بحران میں مبتلا کر دیا۔ ایک طرف دار العلوم دیوبند ۱۸۶۶ء نے دینی تعلیم اور اسلامی شناخت کے تحفظ کا فریضہ انجام دیا، اور دوسری طرف سر سید احمد خان کی علی گڑھ تحریک ۱۸۷۵ء نے مسلمانوں کو جدید علوم کی طرف متوجہ کیا۔ ان دونوں کے درمیان ایک طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ محض دینی یا محض جدید تعلیم کافی نہیں، بلکہ دونوں کے امتزاج کے بغیر

مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔اسی سوچ کے نتیجے میں ندوۃ العلماء کا قیام ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں عمل میں آیا۔(حوالہ شبلی نعمانی، تاریخ ندوۃ العلماء)

ندوہ کے بانیوں میں سب سے نمایاں نام مولانا محمد علی مونگیری (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۷ء) کا ہے، جنہیں اس تحریک کا روحِ رواں کہا جاتا ہے۔ان کے ساتھ مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید محمد حسین بٹالوی اور دیگر علماء بھی شریک تھے۔ندوہ کا بنیادی مقصد قدیم دینی تعلیم اور جدید عصری علوم کے درمیان توازن قائم کرنا تھا تاکہ ملت کے نوجوان اسلام کی تعلیمات میں راسخ ہونے کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں۔اس ادارے نے خاص طور پر عربی زبان وادب کو اپنا محور بنایا تاکہ اسلامی علوم کی اصل روح زندہ رہ سکے۔(سید سلمان ندوی، حیات شبلی)

اس طرح ندوۃ العلماء اگرچہ براہِ راست جنگِ آزادی میں شریک نہیں تھا، لیکن یہ کہنا درست ہے کہ یہ تحریک جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کے فکری و تعلیمی بحران کا اصلاحی جواب تھی۔دیوبند، علی گڑھ اور ندوہ تینوں مختلف دھارے تھے، لیکن مقصد ایک ہی تھا: مسلمانوں کی بیداری اور ان کے علمی و تہذیبی وجود کو زندہ رکھنا۔(مسلمانانِ ہند کی تعلیمی تحریکیں)

یعنی ندوہ نے قدیم اور جدید تعلیم میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔اس کے بانی علماء نے یہ سمجھا کہ اگر مسلمان بدلتے وقت کے تقاضوں سے ناواقف رہے تو پیچھے رہ جائیں گے۔چنانچہ ندوہ نے اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید مضامین کی طرف بھی توجہ دی تاکہ ملت کے نوجوان دورِ جدید کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکیں۔

اس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے اگرچہ مسلمانوں کو وقتی طور پر سیاسی اقتدار سے محروم کیا، مگر اس کی برکت سے ایسی تحریکات نے جنم لیا جنہوں نے ملت کے فکری وجود کو زندہ رکھا۔دیوبند نے دین کی حفاظت کی، ندوہ نے قدیم وجدید کو جوڑا، اور علی گڑھ نے مسلمانوں کو جدید دنیا سے روشناس کیا۔یہ تینوں دھارے مل کر اس بات کی علامت ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی بظاہر شکست دراصل ایک عظیم فتح کی بنیاد بنی۔فتح شعور،

فتحِ ایمان، فتحِ بیداری۔

برطانیہ کے وائسرائے کی رپورٹ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی برطانوی سامراج کے لیے ایک زبردست جھٹکا تھی۔ اگر چہ انگریز فوجی طاقت کے زور پر اس بغاوت کو دبا دینے میں کامیاب ہو گئے، مگر دہلی کے اجڑے ہوئے کوچوں اور شہداء کے خون میں انہیں یہ حقیقت صاف نظر آ گئی کہ ہندوستان پر ہمیشہ کے لیے قابض رہنا آسان نہ ہوگا۔ یہ بغاوت انگریزوں کے دلوں میں خوف اور اندیشے کی ایسی لہر دوڑا گئی کہ انہوں نے فوراً اس سوال پر غور کیا کہ آخر آئندہ سلطنتِ برطانیہ کو ہندوستان میں کس بنیاد پر مستحکم رکھا جا سکتا ہے۔ (غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی)

چنانچہ اس مقصد کے لیے برطانیہ کے وائسرائے نے اپنے وزراء اور ہندوستانی مشیروں سے ایک مفصل رپورٹ طلب کی۔ اس وقت کے انگریزی حکام میں ڈاکٹر ولیم ہنٹر (Dr. William Hunter) کو سیاسی تدبیر اور ہندوستانی حالات پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس نے اپنی مشہور رپورٹ (۱۸۵۸ء کے بعد مرتب کی گئی) میں وائسرائے کو خبردار کیا کہ:

''ہندوستان میں مسلمان ایک زندہ اور بیدار قوم ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی دراصل مسلمانوں کی قیادت میں لڑی گئی۔ ہندو اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ کھڑے رہے جب تک مسلمانوں کا جوش و جذبہ برقرار رہا۔ اصل طاقت مسلمانوں کی تھی، اور جب تک ان کے دلوں میں جہاد کا جذبہ موجود ہے ہم ان پر حکومت نہیں کر سکتے۔ اس لیے سب سے پہلے اس جذبۂ جہاد کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اور جذبۂ جہاد کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور چیز کا خاتمہ ناگزیر ہے، اور وہ ہے ہندوستان کے علما کا وجود اور قرآنِ کریم کی تعلیم۔ جب تک علما موجود ہیں اور قرآن مسلمانوں کے گھروں میں زندہ ہے، اس وقت تک ہماری حکومت کو خطرہ لاحق رہے گا۔'' (The Indian Musalmans, Dr. William Hunter, London)

یہ رپورٹ محض ایک رائے نہ تھی بلکہ آنے والے پورے دورِ استعماری کی پالیسی کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔ انگریز حکمرانوں نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں کو دبانے کے لیے تین محاذوں پر کام کیا جائے:

(R.C. Majumdar, Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857)

۱۔علماء کو کچلنے کی پالیسی

۱۸۵۷ء کے بعد ہزاروں علماء کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔ متعدد کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا اور کئی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ شاہ عبدالقادر، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، حافظ ضامن شہید اور بے شمار دیگر اہلِ علم نے اس راہ میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔

۲۔قرآن کریم کی تعلیم کو محدود کرنا

قرآن مسلمانوں کی زندگی کا سرچشمہ تھا۔ انگریزوں نے مدارس کے خلاف سخت اقدامات کیے اور قرآن فہمی کے مراکز کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ کئی مقامات پر دینی تعلیم دینے والوں پر پابندیاں لگائی گئیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ نئی نسل قرآن کی روحانی و جہادی تعلیم سے ناواقف ہو کر غلامی کو تقدیر کا حصہ سمجھنے لگے۔

(Sir Syed Ahmad Khan, Asbab-e-Baghawat-e-Hind, 1859)

۳۔نئی تعلیمی پالیسی لارڈ میکالے کا نظام

۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے اپنی مشہور تعلیمی رپورٹ پیش کی تھی جس کا عملی نفاذ جنگِ آزادی کے بعد زیادہ شدت سے کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک نئی ایسی نسل پیدا کی جائے جس کے "جسم تو ہندوستانی ہوں مگر دماغ انگریز کی طرح سوچتے ہوں"۔ انگریز جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم سے کاٹ کر مغربی فلسفے اور عیسائی افکار سے جوڑ دیا جائے تو وہ رفتہ رفتہ اپنی اصل سے بیگانہ ہو جائیں گے۔

(Shibli NomaniS. Sulaiman Nadvi, Muslim Civilization in India)

اس طرح بظاہر ۱۸۵۷ء کی جنگ میں انگریز غالب آ گئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد انہوں نے اپنی تمام توانائیاں مسلمانوں کے ایمان، فکر اور تہذیب کو مٹانے پر صرف کر دیں۔ وائسرائے کو بھیجی جانے والی رپورٹ دراصل اس بات کا اعتراف تھی کہ مسلمانوں کو صرف توپ و تفنگ سے شکست نہیں دی جا سکتی بلکہ ان کے روحانی سرچشموں کو نشانہ بنانا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے دور میں ہندوستان کے علماء نے مدارس، خانقاہوں اور تعلیمی تحریکات کے ذریعے قرآن وسنت کے چراغ کو روشن رکھا اور انگریزوں کی سازشوں کو ناکام بنایا۔

دینی جزبات کو نشانہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے صرف سیاسی غلبہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ براہِ راست اسلام، قرآن اور علماء کو نشانہ بنایا۔ ان کی نگاہ میں اصل طاقت مسلمانوں کے ایمان، ان کے دینی جذبات اور خصوصاً قرآنِ کریم کی تعلیم تھی۔ یہی وہ سرچشمہ تھا جو ہر دور میں مسلمانوں کو باطل کے خلاف اٹھنے کی قوت عطا کرتا رہا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک مسلمانوں کو قرآن اور ان کی رہنمائی کرنے والی قیادت علماء سے محروم نہ کیا جائے، ہندوستان پر پائیدار حکومت قائم نہیں کی جا سکتی۔

قرآن مجید کی بے حرمتی

۱۸۶۱ء میں ایک نہایت المناک اور شرمناک واقعہ پیش آیا۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں تین لاکھ سے زائد قرآنِ مجید کے نسخے ضبط کر کے آگ میں جلائے۔ یہ سانحہ صرف کتاب سوزی نہ تھا بلکہ اسلام کی اساس پر حملہ تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنی اصل روحانی طاقت سے محروم ہو جائیں اور ان کے دلوں میں دین کے خلاف بداعتمادی اور کمزوری پیدا ہو۔

اس بے حرمتی کے بعد ہندوستان کے عوام اور علماء میں زبردست غم وغصہ پھیل

گیا۔ کئی شہروں میں مسلمان اس خبر کو سن کر بے چین ہو گئے مگر انگریزوں کی طاقت اور سخت قوانین نے انہیں کھل کر ردِعمل ظاہر کرنے سے روکے رکھا۔ قرآن کو جلانا دراصل ایک اعلان تھا کہ اب انگریز صرف سیاسی حکمران نہیں بلکہ تہذیبی و دینی دشمن بھی ہیں۔

علماء کے خلاف مہم

قرآن کی بے حرمتی کے فوراً بعد انگریزوں نے اپنی دوسری بڑی پالیسی کا آغاز کیا: یعنی علماء کو ختم کرنا۔ انگریز جانتے تھے کہ اگرچہ عام مسلمان جذباتی طور پر اسلام سے وابستہ ہے، لیکن اس کے ایمان اور عمل کو جلا دینے والے علماء ہیں۔ یہی علما تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں جہاد کے فتوے دیے، عوام کو تیار کیا اور انگریزوں کے خلاف قیادت سنبھالی۔

انگریز مؤرخ مسٹر تھامسن (Thomson) اپنی یادداشت میں لکھتا ہے کہ:

''۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۷ء تک کے تین سال ہندوستان کی تاریخ کے بڑے ہولناک سال ہیں۔ انگریزی حکومت نے اس دوران یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے علما کو ختم کر دیا جائے تاکہ آئندہ کسی بغاوت کا امکان نہ رہے۔''

(Thomson, Memoirs on Indian Rebellion, 1867)

ہزاروں علماء کی شہادت

تاریخ کے صفحات اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ ان تین برسوں میں انگریزوں نے ۱۴ ہزار سے زائد علما کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔

بہت سے علماء کو بغیر مقدمہ چلائے پھانسی دے دی گئی۔ کئی کو طویل قید خانوں میں ڈال کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ دہلی، لکھنؤ، کانپور، سہارنپور اور رام پور کے شہروں میں علما کی تلاش اور گرفتاری کے لیے خصوصی فوجی دستے بھیجے گئے۔ جہاں بھی کوئی دینی رہنما یا عالم نظر آتا، اسے بغاوت کا مجرم قرار دے کر شہید کر دیا جاتا۔

یہ وہی علماء تھے جنہوں نے اپنی زندگیاں اسلام کی حفاظت کے لیے وقف کر دی

تھیں۔ان کی زبانوں پر کلمۂ شہادت اور دلوں میں ایمان کی حرارت موجود تھی۔تاریخ بیان کرتی ہے کہ ہزاروں علماء نے تختۂ دار کی رسّی کو بوسہ دے کر شہادت قبول کی مگر دین کی عزت پر آنچ نہ آنے دی۔(مولانا غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی)

انگریزوں کا مقصد

یہ سب اقدامات کسی وقتی انتقام کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ ایک باقاعدہ پالیسی تھی۔ انگریز چاہتے تھے کہ:

۱۔قرآن کو ختم کر کے مسلمانوں کو ان کے اصل سرچشمے سے کاٹ دیا جائے۔
۲۔علما کو مٹا کر ان کی قیادت کو ختم کر دیا جائے۔
۳۔نئی نسل کو لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم کے تحت مغربی تہذیب میں ڈھالا جائے۔

یعنی ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۷ء کے درمیان کے یہ واقعات ہندوستان کی تاریخ کے سیاہ ترین ابواب ہیں۔قرآن کی بے حرمتی اور ہزاروں علما کی شہادت نے اگرچہ وقتی طور پر مسلمانوں کو کمزور کر دیا،مگر انہی قربانیوں نے بعد میں دینی بیداری اور تحریکاتِ آزادی کی بنیاد رکھی۔یہی علما کی شہادتیں تھیں جنہوں نے دیوبند، ندوہ، جمعیت علماء ہند، فرنگی محل اور دیگر دینی مراکز کے قیام کو جنم دیا۔قرآن کو جلایا گیا، علما کو شہید کیا گیا، مگر اسلام کا چراغ نہ بجھ سکا، بلکہ پہلے سے زیادہ روشنی پھیلانے لگا۔

انگریز جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو قیادت فراہم کرنے والی علماء کی یہ جماعت باقی رہی تو کبھی نہ کبھی آزادی کی نئی لہر ضرور اٹھے گی۔ انگریز مؤرخ مسٹر تھامسن اپنی یادداشت میں لکھتا ہے کہ:

''۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۷ء تک کے تین برس ہندوستان کی تاریخ کے سب سے المناک برس ہیں، کیونکہ انگریزی حکومت نے ان برسوں میں طے کیا کہ مسلمانوں کے علما کو ختم کر دیا جائے''۔

چنانچہ ان تین سالوں میں پورے برصغیر میں ایک منظم مہم کے تحت گرفتاریوں اور پھانسیوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ہزاروں علماء کو باغی اور فتنہ انگیز قرار دے کر تختۂ دار پر لٹکا یا گیا۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ صرف انہی تین برسوں میں ۱۴ ہزار علماء کو شہید کر دیا گیا۔ یہ وہ علماء تھے جن کی زبان پر اللہ کا کلمہ تھا اور دل میں دین کی حرارت۔ وہ تختۂ دار کی رسّی کو مسکرا کر گلے لگاتے رہے مگر اپنے ایمان اور دین پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔

علماء کو دی جانے والی عبرت ناک سزائیں

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریز صرف مسلمانوں کی سیاسی طاقت سے ہی خائف نہ تھے بلکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے علماء موجود ہیں، ان کے دلوں سے حریت اور ایمان کی شمع بجھائی نہیں جا سکتی۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے علما کو اس طرح ختم کیا جائے کہ باقی امت پر رعب طاری ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے تاریخ نے ایسے ایسے ظلم دیکھے جو رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ (علماء حق کی قربانیاں، ص45)

انگریز مؤرخ تھامسن اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

" The fanaticism of the Mohammedans was the great motive power of the insurrection the Maulvis and the Moulahs were everywhere the instigators of revolt, and wherever our troops advanced, they found the bodies of these men suspended from trees".(The Story of Cawnpore, P.257

''دہلی کے چاندنی چوک سے لے کر خیبر تک کوئی درخت ایسا نہ تھا جس پر کسی عالمِ دین کی لاش نہ جھول رہی ہو'۔ علماء کو سروں کی کھال میں بھر کر جلتے ہوئے تنوروں میں ڈال دیا جاتا، ان کے جسموں کو تانبے کی گرم سلاخوں سے داغا جاتا، درختوں کے ساتھ باندھ کر گولیوں سے چھلنی کیا جاتا، اور انہیں اذیت ناک طریقوں سے شہید کیا جاتا۔

(شبلی نعمانی، الکلام، جلد اوّل، ص47)

لاہور کی شاہی مسجد بھی انگریزوں کے ظلم کا مرکز بنی۔ وہ جگہ جہاں کبھی ہزاروں مؤمنین سجدہ ریز ہوتے تھے، انگریزوں نے اسی کے صحن میں پھانسی کا پھندا نصب کیا۔ ایک ہی دن میں اسی اسی علما کو تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا۔ اسی لاہور میں دریائے راوی علما کے خون سے لال ہوا۔ بوریوں میں بھر کر علما کو دریا میں پھینکا جاتا اور پھر انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا۔ (ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ، جلد دوم)

تھامسن مزید لکھتا ہے کہ ایک دن میں نے دہلی میں اپنے خیمے کے پیچھے شدید تعفن محسوس کیا۔ جب میں گیا تو دیکھا کہ انگارے دہک رہے ہیں اور ان پر چالیس علماء برہنہ کر کے ڈالے گئے ہیں۔ میرے سامنے مزید چالیس علما کو لایا گیا اور انگریز افسر نے کہا:

''اے مولویو! اگر تم یہ کہہ دو کہ ہم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شریک نہیں تھے تو ابھی چھوڑ دیتے ہیں، ورنہ تمہیں بھی انہی انگاروں پر پکا دیا جائے گا۔''

تھامسن اعتراف کرتا ہے:

''مجھے اپنے پیدا کرنے والے کی قسم ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کوئی عالم ایسا نہ تھا جس نے انکار کیا ہو۔ سب کے سب آگ میں جل کر شہید ہو گئے، مگر ان میں سے ایک نے بھی انگریز کے سامنے اپنی گردن نہ جھکائی۔''

(برصغیر میں تحریک آزادی اور علما کی قربانیاں، ص112)

یہ وہ عظیم قربانیاں تھیں جنہوں نے اس بات پر مہر ثبت کر دی کہ ہندوستان کے علما نے اپنی جانیں قربان کر دیں مگر دین وملت کی عزت پر آنچ نہ آنے دی۔

(علماء حق کی قربانیاں، ص63)

علماء کی قربانیاں اور تاریخی ناانصافی

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایک تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جنہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے اس ملک کی بنیادوں کو خون سے سینچا، آج ان کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب پورا ملک انگریز

کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو سب سے آگے علماء کرام تھے۔ تاریخ دانوں کے مطابق چودہ ہزار علماء کو مختلف شہروں اور قصبوں میں تختۂ دار پر لٹکایا گیا (''تاریخ علمائے ہند''، شبلی نعمانی، جلد دوم)۔ لیکن آج جب آزادی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ان قربانیوں کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور محض چند خاص کرداروں کو ہی اجاگر کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ علماء جنہوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں، وہ کس کے لئے شہید ہوئے؟ کیا ان کی قربانیاں ہندوستان کی آزادی کی بنیاد نہیں تھیں؟

سید احمد اللہ شاہ مدراسیؒ کی غیرت ایمانی

ان علماء میں سے ایک عظیم نام مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کا بھی ہے، جنہیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں قید کیا گیا۔ جب انگریز افسر کے سامنے ہتھکڑیوں میں لایا گیا تو وہ افسر جذباتی ہو کر رونے لگا اور کہنے لگا: ''شاہ صاحب! آپ تو میرے استاد ہیں، میں نے مدراس میں آپ سے عربی پڑھی تھی۔ اگر آپ ایک بار یہ کہہ دیں کہ آپ اس بغاوت میں شریک نہیں تھے تو میں آپ کو فوراً رہا کر دوں گا''۔ لیکن احمد اللہ شاہؒ نے جواب دیا: ''اے میرے شاگرد! میں اپنی جان بچانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے غداری نہیں کر سکتا''۔ یہ الفاظ ان کے ایمان اور غیرت کی گواہی ہیں۔

(حوالہ: تاریخ جنگِ آزادی 1857ء، مولانا غلام رسول مہر، ص 341)

مدارس کو ختم کرنے کا فیصلہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے پورے ہندوستان پر اپنا قبضہ مضبوط کیا تو انہوں نے سب سے پہلے دین و مذہب کے مراکز کو نشانہ بنایا۔ انگریزوں کے نزدیک علماء اور مدارس ہی وہ طاقت تھے جو عوام میں دینی شعور، حریت اور آزادی کی لہر پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء سے لے کر ۱۸۶۷ء تک انگریزوں نے منظم منصوبے کے تحت پورے ہندوستان میں دینی مدارس کو تباہ و برباد کیا اور علماء کو

سخت مظالم اور قتل و غارت کا نشانہ بنایا۔ اس دور کو ہندوستان کی تاریخ میں ''علماء کی قربانیوں کا عہد'' کہا جاتا ہے۔ (تاریخ تحریکِ آزادی ہند، جلد دوم، ص ۲۸۹)

۱۸۶۷ء تک یہ صورتِ حال ہو چکی تھی کہ برصغیر میں کوئی بڑا دینی مدرسہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہا۔ وہ ادارے جو کبھی علم و عرفان کا مرکز تھے، یا تو مسمار کر دیے گئے یا سرکاری قبضے میں لے کر غیر مؤثر بنا دیے گئے۔ حتیٰ کہ دہلی میں قائم ''شاہ ولی اللہ دہلویؒ'' اور ان کے خانوادے کے قائم کردہ مدارس بھی اس عتاب سے محفوظ نہ رہ سکے۔

(مولانا مناظر احسن گیلانی، برصغیر میں اسلام کا نظامِ تعلیم، ص ۱۴۷)

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ انگریز جب ۱۶۰۸ء میں ہندوستان آئے تو اس وقت صرف گجرات اور دہلی کے علاقے میں ایک ہزار سے زائد دینی مدارس موجود تھے جو علومِ قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم کا مرکز تھے۔ مگر ۱۸۶۷ء تک آتے آتے انگریز حکومت نے منظم پالیسی کے ذریعے تقریباً تمام مدارس کا خاتمہ کر دیا۔

(ہندوستان کی دینی درسگاہیں اور تحریکِ آزادی، ص ۶۳)

لیکن اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کے لیے ایسے مردانِ حق کو پیدا کیا جنہوں نے اس تاریک ماحول میں بھی علم کی شمع کو بجھنے نہ دیا۔ انہی مجاہدینِ علم و دین میں ایک نمایاں نام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ہے۔ آپ نے حالات کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو سہارنپور کے قریب ایک چھوٹی سی بستی ''دیوبند'' میں انار کے درخت کے نیچے محض چند طلبہ کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ بعد میں ''دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے جانا گیا، جو نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالمِ اسلام میں دینی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔

(سید محمود احمد، تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص ۳۵)

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برصغیر میں انگریزوں کی سیاسی گرفت بہت مضبوط ہوگئی۔ آزادی کی ہر تحریک کو کچل دیا گیا اور مسلمانوں کو بالخصوص

انگریزوں کے غیظ وغضب کا سب سے زیادہ نشانہ بننا پڑا۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اہلِ ہند میں یہ احساس بیدار ہوا کہ انگریزی اقتدار کے خلاف منظم سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم درکار تھا جو مختلف طبقات کو یکجا کر سکے۔

چنانچہ ۱۸۸۴ء بمبئی میں ایک غیر رسمی مشاورتی اجلاس ہوا جس میں بعض ممتاز ہندو اور مسلمان اہلِ علم واہلِ فکر شریک ہوئے۔ اس اجلاس کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ کانگریس کے بانی اراکین میں اے۔او۔ ہیوم (A.O. Hume)، ڈبلیوسی بونر جی، دادا بھائی نوروجی کے ساتھ ساتھ نمایاں مسلمان رہنما بدرالدین طیب جی اور رحمت اللہ سیانی شامل تھے۔ کانگریس کا پہلا صدر ڈبلیوسی بونر جی منتخب ہوا۔ (حوالہ: بپن چندر، انڈیا ز اسٹرگل فار انڈیپنڈنس، ص ۱۱۲)

۱۸۸۶ء میں کانگریس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی، اور یہ اجلاس ہندوستانی سیاست میں ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔ اس کے بعد کانگریس کا تیسرا اجلاس ۱۸۸۶ء ہی کے آخر میں بمبئی میں ہوا۔ چوتھا اجلاس ۱۸۸۷ء میں مدراس (چنائی) میں منعقد ہوا جس کی صدارت پہلی مرتبہ کسی مسلمان رہنما، یعنی بدرالدین طیب جی نے کی۔ یہ کانگریس کے لیے تاریخی موقع تھا کہ ایک مسلمان قائد اس پلیٹ فارم کی قیادت کر رہا تھا۔ (ایس۔ گاندھی، انڈین نیشنل کانگریس، اے ہسٹری، جلد اول، ص ۴۵)

ابتدائی دور میں کانگریس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انگریز حکومت کے سامنے ہندوستانیوں کے مسائل، شکایات اور مطالبات پرامن اور وفادارانہ انداز میں پیش کیے جائیں۔ تاہم اس نے ہندوستان کی سیاست میں ایک نئی بیداری پیدا کی اور ہندو مسلم رہنماؤں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لاکر آزادی کی جدوجہد کی راہ ہموار کی۔ یہی پلیٹ فارم آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ میں تحریکِ آزادی کا سب سے بڑا سیاسی ادارہ ثابت ہوا۔ (حوالہ: رومیلا تھاپر، ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم، ص ۲۸۵)

ریشمی رومال تحریک اور شیخ الہند کی قربانیاں

۱۹۱۲ء میں ہندوستان میں ایک اہم تحریک کی ابتدا ہوئی جسے ریشمی رومال تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک کے بانی حضرت شیخ الہند، مولانا محمد حسن دیوبندیؒ تھے، جنہیں عالم اسلام میں ایک فقیہ، مجاہد اور انگریز حکومت کے سخت مخالف کے طور پر جانا جاتا ہے۔ بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، شیخ الہندؒ ہندوستان میں انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن اور مخالف تھے، اور سلطنتِ ٹیپو سلطان کے بعد برصغیر میں اس کے مانند ایک غیر مطیع اور باہمت رہنما دوبارہ نہیں آیا۔

(سید ابوالحسن علی ندوی، شیخ الہند کی زندگی اور خدمات، ص ۱۱۲)

شیخ الہندؒ کے شاگردوں کا کردار

اس تحریک میں شیخ الہندؒ کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے خاص کردار ادا کیا۔ ان کا مشن تھا کہ افغانستان کی حکومت کو ہندوستان میں آزادی کے لیے معاون بنایا جائے اور انگریزوں کے خلاف عوامی رائے عامہ قائم کی جائے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک سرگرم رہتے ہوئے خلافتِ عثمانیہ کے ذمہ داران جیسے انور پاشا سے رابطے کی کوششیں کیں۔ شیخ الہندؒ نے خود ترکی جانے کا عزم مصمم کرلیا اور اس مقصد کے لیے پہلے حج کیا، جہاں دو سال قیام کے دوران انہوں نے مکہ اور مدینہ میں موجود ترک گورنر اور وزراء سے ملاقاتیں کیں۔ (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، شیخ الہند کے خطوط اور مراسلات، ص ۱۴۵)

گرفتاریاں اور جلاوطنی

شیخ الہندؒ کے منصوبے کی خبر انگریز حکومت تک پہنچ گئی، اور انہیں گرفتار کر کے ان کی سرگرمیوں کو ناکام بنانے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۱۶ء میں شریف حسین کی حکومت نے شیخ الہندؒ کو مدینہ منورہ میں گرفتار کر کے انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا۔ شریف حسین، جو خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کا مرتکب اور برطانوی حکومت کا حلیف تھا، نے مسلمانوں

کی آزادی کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ (ریشمی رومال تحریک اور شیخ الہندؒ کی جدوجہد، ص ۹۲)

۱۹۱۷ء میں شیخ الہندؒ اور ان کے ساتھیوں کو بحیرہ روم میں واقع جزیرہ مالٹا جلاوطن کیا گیا۔ اس دوران مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیز گل پیشاوریؒ، مولانا حکیم نصرت حسینؒ، مولانا وحید احمدؒ اور دیگر شاگرد بھی شیخ الہندؒ کے ساتھ سخت مشکلات برداشت کرتے رہے۔ مالٹا کے قید خانوں میں ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، سخت ترین سزاؤں اور اذیتوں کے باوجود انہوں نے اپنے عزم اور قربانی کا دامن نہیں چھوڑا۔

(عبدالمجید، شیخ الہندؒ اور مالٹا کی جلاوطنی، ص ۱۱۸)

تحریک کی اہمیت

ریشمی رومال تحریک نہ صرف انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی ایک شکل تھی بلکہ یہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی شعور اور اتحاد کی علامت بھی تھی۔ شیخ الہندؒ اور ان کے شاگردوں کی قربانیاں اس بات کا مظہر ہیں کہ برصغیر کی آزادی کی راہ میں مسلمانوں نے کس حد تک صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ (سید ابوالحسن علی ندوی، شیخ الہند کی زندگی اور خدمات، ص ۱۶۳)

شیخ الہندؒ کی قربانیاں

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں کہ جب شیخ الہندؒ کو جزیرہ مالٹا کی جیل میں نظر بند کیا گیا تو انگریز انہیں ایک تہہ خانے میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے لوہے کی گرم اور تپتی ہوئی سلاخیں شیخ الہندؒ کے کمر پر لگا کر شکنجہ ڈالا اور بار بار حکم دیا کہ وہ انگریزوں کے حق میں فتویٰ صادر کریں۔ شیخ الہندؒ کی وفاداری اور دینی اصولوں کی غیر متزلزل پختگی یہاں نمایاں ہوئی۔ وہ بار بار فرماتے:

''اے انگریز! میرا جسم پگھل سکتا ہے، میں بلا کا وارث ہوں، میری جلد ادھیڑ سکتی ہے، لیکن میں ہرگز تمہارے حق میں فتویٰ نہیں دے سکتا''۔

(مولانا حسین احمد مدنی، تاریخ حیات شیخ الہندؒ، ص ۲۳۴)

شیخ الہندؒ کے شاگرد اور معاونین

شیخ الہندؒ کی تحریک میں نمایاں ارکان میں: مولانا منصور انصاریؒ، مولانا فضل ربیؒ، مولانا فضل محمدؒ، مولانا محمد اکبرؒ، مزید مخلص اور معاونین میں ،مولانا عبد الرحیم رائے پوریؒ، مولانا محمد احمد چکوالیؒ، مولانا صادق کراچویؒ، شیخ عبد الرحیم سندھیؒ، مولانا احمد اللہ پانی پتیؒ، ڈاکٹر احمد انصاریؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا عبدابوالکلام آزادؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، حکیم اجمل خانؒ یہ تمام افراد شیخ الہندؒ کی رہنمائی میں مخلصانہ خدمات انجام دیتے رہے اور تحریک کو فعال رکھتے تھے۔ (شیخ الہندؒ کی تحریک اور قیادت، ص ۱۴۲)

۱۹۱۸ء میں تحریک خلافت

جنگ عظیم اول کے دوران، ۱۹۱۸ء میں سلطنت عثمانیہ کے ترکوں کی شکست، قسطنطنیہ پر قبضے اور اتحادی طاقتوں کے ہاتھوں عثمانی سلطنت کی تقسیم نے دنیا اسلام بالخصوص ہندوستان میں شدید تہلکہ پیدا کیا۔ اس موقع پر ہندوستان کے علماء اور نوجوانوں نے ملک گیر احتجاجی اور سیاسی اقدامات کا سلسلہ شروع کیا۔

حضرت مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علیؒ نے اس تحریک میں مرکزی کردار ادا کیا، اور ملک بھر میں احتجاجی جلسے منعقد کیے۔ دہلی میں ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کا پہلا کنفرنس منعقد ہوا، جس میں ''تحریک خلافت'' کو رسمی طور پر آغاز دیا گیا۔ اسی اجلاس میں ترک مال و مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا، جو عوامی سطح پر بڑا اثر ڈالنے والا اقدام تھا۔ (سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ خلافت تحریک، ص ۱۲۰)

تحریک خلافت میں نہ صرف مسلمان علماء بلکہ غیر مسلمین بھی بالخصوص گاندھی جی نے شانہ بشانہ حصہ لیا۔ یہ تحریک دینی، سیاسی اور اقتصادی تمام محاذوں پر برصغیر کی آزادی کی جدوجہد کا حصہ تھی۔ شیخ الہندؒ اور ان کے شاگردوں کی قربانیاں اس تحریک کی روح اور رہنمائی کا بنیادی ستون تھیں۔ (تحریک خلافت اور شیخ الہند، ص ۱۵۵)

۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء ہند کا قیام

۱۹۱۹ء میں ہندوستان میں ''جمعیت علماء ہند'' کا قیام عمل میں آیا، جس کے بنیادی ارکان میں نمایاں علماء اور دانشور شامل تھے، جنہوں نے دینی اور سیاسی ذمہ داریوں کو یکجا کرتے ہوئے ملک وملت کی خدمت کا عظیم فریضہ انجام دیا۔ ان میں شامل تھے: شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عطا اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا ابوالمحاسن سجادؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا ابو الکلام آزادؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندی۔

یہ علماء اپنی دینی بصیرت، علمی قابلیت اور قومی شعور کی وجہ سے مشہور تھے۔ شیخ الہندؒ کی رہائی کے بعد، سب سے پہلے ۲۹ جولائی ۱۹۲۰ء کو ترک مصنوعات کے بائیکاٹ کا فتویٰ جاری کیا گیا، جو تحریک خلافت کی ابتدائی کارروائیوں میں شامل تھا۔

(سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ خلافت تحریک ہند، ص ۱۸۵)

شیخ الہندؒ کے وفات کے بعد، ان کے شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ان کے مشن کو جاری رکھا۔ بعد ازاں، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے ۱۹۴۰ء سے تحریک کے آخری دنوں تک جمعیت علماء ہند کی قیادت سنبھالی۔ انہوں نے کئی بار برطانوی عدالتوں میں پھانسی کی سزا سے بچ کر دینی اور قومی خدمات انجام دیں۔ مولانا کفایت اللہ دہلویؒ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کے منصب پر بھی فائز رہے۔

(جمعیت علماء ہند: قیادت اور خدمات، ص ۲۰۳)

جلیانوالہ باغ سانحہ اور خلافت تحریک

۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ سانحہ پیش آیا، جس میں سینکڑوں افراد شہید اور زخمی ہوئے۔ اسی دوران تحریک خلافت نے زور پکڑا، جس کے بانی مولانا محمد علی جوہرؒ تھے۔ اس تحریک نے

ہندو اور مسلم اتحاد کو فروغ دیا، اور ملک گیر سطح پر احتجاجی و سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

اس تحریک میں علماء اور رہنماؤں نے فعال کردار ادا کیا، جن میں نمایاں تھے: شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا آزاد سبحانیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا سید محمد فخرؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ۔

تحریک خلافت میں ہندوستان کے بزرگ علماء نے سالہا سال کے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، مشترکہ پلیٹ فارم پر شانہ بشانہ کام کیا، جس سے مسلمانوں کی سیاسی و دینی قیادت کو ایک مضبوط مؤقف حاصل ہوا۔

(سید ابوالحسن علی ندوی، تحریک خلافت اور ہندوستان کے علماء، ص ۲۱۰)

تحریک ترک مال و بائیکاٹ

۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزادؒ نے غیر ملکی مال کے بائیکاٹ اور نان کوآپریشن تحریک کی تجویز پیش کی، جسے تحریک آزادی اور قومی جدوجہد میں ایک انتہائی مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس تحریک نے نہ صرف ہندوستانیوں میں قومی شعور پیدا کیا بلکہ انگریز حکومت کو بھی اس کے اثرات سے لاعلم نہیں رہنے دیا۔

انگریز حکومت اس تحریک کی باریکیوں اور اقدامات کا مکمل نوٹ رکھنے پر مجبور ہو گئی، کیونکہ اس کے نتیجے میں ملکی نظام کی کارکردگی متاثر ہو رہی تھی اور عام سطح پر بغاوت کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اس بائیکاٹ اور ترک موالات کے اثرات نے انگریز حکمرانوں میں خدشہ پیدا کر دیا کہ پورا نظام مفلوج ہو جائے گا اور عوامی بغاوت پھیل سکتی ہے۔

اس تحریک کے بعد ہندوستان میں متعدد سیاسی و سماجی احتجاجی تحریکیں منظر عام پر آئیں، جن میں قابل ذکر ہیں:

۱۹۲۱ء میں موپلا بغاوت (Moplah Rebelion)۔

۱۹۲۲ء میں چوری جورہ گاؤں میں پولیس فائرنگ۔
۱۹۳۰ء میں تحریک سول نافرمانی اور نمک آزادی کا اندولن۔
یہ تحریکیں قومی شعور کے فروغ اور برطانوی تسلط کے خلاف عوام کی مشترکہ جدوجہد کی مثالیں ہیں۔(تحریک عدم تعاون اور ترک مال،ص ۱۵۸)

مولانا محمد علی جوہرؒ کا انتقال

۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی جوہرؒ لندن میں گول میز کانفرنس (Round Table Conference) میں ہندوستان کی نمائندگی کے لیے گئے تھے۔ اتفاقاً اسی دوران ان کا انتقال ہو گیا۔ حکومتِ برطانیہ نے ان کی لاش پر خرچ کرتے ہوئے اسے ''بیت المقدس'' بھیجا، اور انہیں وہاں ''مقدس زمین میں مدفون'' کیا گیا۔

مولانا محمد علی جوہرؒ کی علمی، دینی اور قومی خدمات آج بھی ہندوستان اور مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہیں، اور ان کی جدوجہد تحریک خلافت اور قومی آزادی کے حوالے سے لازوال مقام رکھتی ہے۔(سید ابوالحسن علی ندوی، زندگی وخدمات مولانا محمد علی جوہرؒ ص ۲۱۰)

ہندوستان چھوڑو تحریک (Quit India Movement)

۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک (Quit India Movement) شروع ہوئی، جو برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی آزادی کی سب سے بڑی عوامی تحریکوں میں سے ایک تھی۔ اس تحریک کے دوران ممبئی میں بحری بیڑے کی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں پر پولیس نے فائرنگ کی، جس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔

اس دوران عوام کو نہ صرف قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں بلکہ بہت سے لوگ انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بھی بنے۔ عام مسلمانوں کے علاوہ، شہید علماء کی تعداد بیس ہزار سے پچاس ہزار تک بتائی جاتی ہے، لیکن ان اہم رہنماؤں اور واقعات کے بغیر تاریخ

ادھوری اور حقیقت سے بہت دور ہے۔

اس تحریک میں نہ صرف علماء کرام بلکہ مشہور شخصیات نے بھی بھرپور حصہ لیا، جن میں شامل ہیں: بہادر شاہ ظفر، بیگم محل، نواب مظفر الدوالہ، امام بخش صہبائی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا حسرۃ موہانی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود

ان کے علاوہ بھی ایک بڑی تعداد میں مسلمان علماء و رہنما اس جنگ آزادی میں سرگرم رہے، جن کی قربانیاں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں اور ان کی یاد دلوں میں تازہ رہنی چاہیے۔

یہ واضح کرتا ہے کہ ہر موقع پر مسلمان نے آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں، لیکن آج ان کے کردار کو اکثر فراموش کیا جا رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جدید تاریخ کی کتابوں اور قومی یادداشت میں ان کی خدمات کو شامل کیا جائے۔ (تحریک آزادی ہند،ص ۲۸۷-۲۹۰)

آخری دور کے علماء کی قربانیاں

جنگ آزادی میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور فرزندان دار العلوم دیو بند شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا عزیز گل پیشاوریؒ، مولانا منصور انصاریؒ، مولانا فضل ربیؒ، مولانا محمد اکبرؒ، مولانا احمد چکوالیؒ، مولانا احمد اللہ پانی پتیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ وغیرہ ہم کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

آزادی کی پہلی صبح

۱۹۴۶ء کے اختتام کے قریب ہندوستان میں عارضی ہندو مسلم حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو مجلس دستور ساز ہند کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔ اس اجلاس میں مسلمانوں کی نمائندہ شخصیات میں شامل تھیں: مولانا ابو الکلام آزادؒ، خان عبد الغفار خان

(وفات: ۲۲ جنوری ۱۹۸۸ء)، مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلی، رفیع احمد قدوائی

اسی روز ڈاکٹر راجندر پرشاد بالاتفاق دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہوئے۔ ملک کے تمام صوبوں میں منتخب نمائندوں پر مشتمل حکومتیں قائم ہو چکی تھیں اور یہ آزاد ہندوستان کی سیاسی بنیاد رکھی گئی۔

اسی دوران انگریز وائسرائے لارڈ ڈیول کی جگہ ایڈمرل وائیکاونٹ ماونٹ بیٹن وائسرائے ہند بن کر دہلی تشریف لائے، تاکہ نئی سیاسی صورت حال میں برطانیہ کی نمائندگی کریں اور عبوری حکومت کے قیام میں رہنمائی فراہم کریں۔

شمع آزادی کے چند پروانے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک

۱۔عبدالمجید ۲۔عبدالرحیم ۳۔عبدالشکور ۴۔شیخ علاء الدین ۵۔شیخ علاء الدین ۶۔محمد حنیف ۷۔محمد ہاشم ۸۔حاتم علی ۹۔محمد ادریس ۱۰۔محمد اسحاق ۱۱۔محمد اسمٰعیل ۱۲۔جناب میاں ۱۳۔کبیر اشرفی ۱۴۔میر عبداللہ ۱۵۔محمد مسلم ۱۶۔رفیق میاں ظفر میاں ۱۷۔نواب رشید خان ۱۸۔سید عرف چھوٹو ۱۹۔شیخ محمد حنیف ۲۰۔شیخ محمد عثمان ۲۱۔شیخ دھنک ۲۲۔محمد صدیق ۲۳۔سلطان خان ۲۴۔مولوی تجمل حسین ۲۵۔ابوبکر ۲۶۔محمد امین ۲۷۔محمد یوسف ۲۸۔غلام شریف ۲۹۔امتیاز خان ۳۰۔ضمیر الدین ۳۱۔قدم رسول ۳۲۔محمد حارث ۳۳۔پا پا میاں ۳۴۔شمس الدین ۳۵۔یعقوب علی ۔۳۶۔مولانا ابوالکلام آزاد ۳۷۔مولانا محمد علی جوہر ۳۸۔مولانا شوکت علی ۳۹۔مولانا حسرت موہانی ۴۰۔تصدق حسین شروانی ۴۱۔مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ۴۲۔مولانا سید محمد میاں ۴۳۔مولانا مفتی کفایت اللہ ۴۴۔مولانا احمد سعید دہلوی ۴۵۔مولانا عبدالحلیم صدیقی ۴۶۔عطاءاللہ شاہ بخاری ۴۷۔علامہ انور صابری ۴۸۔مسٹر آصف علی بیرسٹر ۴۹۔مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ۵۰۔رفیع احمد قدوائی ۵۱۔وزیر محمد ۵۲۔تاج محمد فضل محمد ۵۳۔عبدالعلی دین محمد ۵۴۔عبدالعزیز ۵۵۔عبدالعزیز عبدالرزاق ۵۶۔عبدالعزیز عبدالرحمٰن ۵۷۔عبدالغنی ۵۸۔عبدالکریم ۵۹۔عبدالستار محمد عمر

۶۰۔عبداللہ عبدالقادر ۶۱۔محمد حسین آدم جی ۶۲۔علی محمد ۶۳۔انوار حسین ۶۴۔اصغر اسمٰعیل ۶۵۔اصغر میاں نواستی ۶۶۔عزیز عرف چھوٹو۔۶۷۔دلاور عبدالملک ۶۸۔فدا علی قیام علی ۶۹۔غلام حسین علی محمد ۷۰۔ابراہیم یوسف ۷۱۔اسمٰعیل حسین ۷۲۔اسمٰعیل حسین ۷۳۔اسمٰعیل رحمت اللہ ۷۴۔خدا بخش پیارے ۷۵۔منظور احمد ۷۶۔محمد ابوبکر ۷۷۔محمد عزیز ۷۸۔محمد حسین ۷۹۔محمد حسین سید حسین ۸۰۔غلام شیخ محی الدین ۸۱۔محمد سمیع ۸۲۔مولا بخش عبدالعزیز ۸۳۔ذکی الدین سلیمان جی۔

❀❀❀

باب (دوم)

یوم جمہوریہ
یعنی
٢٦/جنوری ١٩٥٠ء کا پس منظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یوم جمہوریہ ہند: اہمیت اور دستوری نظام

ہندوستان پر صدیوں کے دوران مختلف غیر ملکی قوموں نے متعدد بار حملے کیے، مگر ان کے اقتدار کو دیر پا کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ۱۵ویں صدی کے آخر میں یورپی قوموں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں پرتگالی اور فرانسیسی شامل تھے۔ سب سے آخر میں برطانوی ہندوستان آئے اور تجارت کے ذریعے یہاں اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ مسلمان بادشاہوں کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے بالآخر پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

(India under British Rule ص۱۰۵-۱۱۰)

۱۸۴۷ء تک برصغیر میں آزادی کی تحریکیں جاری رہیں، مگر ہندوستانی عوام کی اجتماعی جدوجہد اور قربانیوں کے بغیر برطانوی راج ختم نہ ہو سکا۔ آزادی کے بعد بھی یہاں برطانوی قوانین نافذ تھے، جس کی اصلاح کے لیے اجتماعی جدوجہد جاری رہی۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء اور دستور ہند

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان کے آئین کا نفاذ عمل میں آیا، جس کے ذریعے ملک میں عوامی اور جمہوری حکمرانی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس دن کو یوم جمہوریہ کے طور پر منایا جاتا ہے تاکہ عوام میں جمہوری شعور اور آئین کی بالادستی کو فروغ دیا جا سکے۔

ہندوستانی عوام نے اپنی بے پناہ قربانیوں، خطیر رقومات اور انتظامی اصلاحات کے بعد یہ آئین نافذ کیا، جس کے تحت سبھی شہری برابر، آزاد اور قانون کی حفاظت کے تحت ہوں۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی قیادت میں اس آئین میں ملک کے تمام طبقات اور مذاہب کی رعایت کو یقینی بنایا گیا۔

(ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر، Drafting of the Indian Constitution ص۱۲-۲۰)

جمہوری نظام

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں ہندوستانی جمہوری نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ جمہوریت کا مطلب ہے: ''عوام کی حکومت، عوام کے لیے، عوام کے ذریعہ''۔ اسی طرح دنیا میں حکومت کے تین نظام رائج ہیں جیسے:

۱۔جمہوری نظام:

عوامی نمائندگی پر مبنی اور زیادہ مؤثر نظام۔

۲۔شاہی نظام:

حکمرانی نسل در نسل منتقل ہوتی ہے۔

۳۔شورائی نظام:

چند باصلاحیت افراد کی رائے اور فیصلہ سازی پر مبنی۔

ہندوستان نے جمہوری نظام اختیار کیا، جو عوام کی شمولیت اور اختیارات کو یقینی بناتا ہے۔ (:ڈاکٹر اپیتا بھ سنگھ، Democracy in India ص ۵۰-۶۰)

دستوری خصوصیات

ہندوستان کے دستور کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔تحریری اور مفصل دستور۔ ۲۔ٹھوس اور لچکدار قوانین۔ ۳۔سیکولر اصول اور عوامی جمہوریت۔ ۴۔ پارلیمانی طرز حکمرانی۔ ۵۔ وفاقی نظام۔ ۶۔ بنیادی حقوق۔ ۷۔ آزاد عدلیہ ۔ ۸۔ واحد شہریت۔ یہ خصوصیات ہندوستانی جمہویت کو مضبوط اور مستحکم کرتی ہیں۔

(بھارت سرکار Constitution of India: ۱۹۵۰ء)

جمہوریت کے عناصر

کسی بھی جمہوری نظام کی بقا اور استحکام کے لیے مختلف عناصر ضروری ہیں:

۱۔انتظامیہ (Executive)

٢۔مقنّن (Legislature)

٣۔عدلیہ(Judiciary)

٤۔میڈیا(Media)

یہ عناصر نہ صرف جمہوری نظام کو مضبوط کرتے ہیں بلکہ عوام کو انصاف، معلومات اور شفافیت فراہم کرتے ہیں۔ ہندوستانی جمہوریت میں رنگ ونسل، مذہب، جنس اور سکنات کی بنیاد پر تقسیم ممنوع ہے اور ہر شہری کا یہ اخلاقی وقانونی فرض ہے کہ وہ جمہوریت کے اصولوں کی پاسداری کرے۔

یوم جمہوریہ کی اہمیت

ہر سال ٢٦ جنوری کو یوم جمہوریہ کے طور پر منایا جاتا ہے، جس میں ملک گیر تقریبات، پریڈز اور عوامی اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں۔ یہ دن قانون کی بالا دستی، جمہوری حکمرانی اور عوامی شمولیت کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے۔

آزادی اور یوم جمہوریہ

١٩٤٧ء میں ہندوستان آزاد ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم مقرر ہوئے، سردار پٹیل وزیر داخلہ، اور نواب زادہ لیاقت علی خان وزیر مالیات۔ ٩ دسمبر ١٩٤٦ء کو دستور ساز اسمبلی کا افتتاح ہوا۔

٢٦ جنوری ١٩٥٠ء کو دستور ہند نافذ ہوا، اور اس دن کو یوم جمہوریہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ دن قانون کی بالا دستی، عوامی حکومت اور جمہوری نظام کے استحکام کی یاد دلاتا ہے۔

❁❁❁

باب (سوم)

قومی پرچم
اور
اس کی حقیقت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قومی پرچم کی پہچان

کسی بھی ملک کی پہچان کے لیے اس کا ایک نشان، پرچم کی شکل میں ہوتا ہے جسے قومی پرچم کہا جاتا ہے۔ یہ پرچم ملک کے قومی نظریہ یا تشخص کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کا بھی ایک قومی پرچم ہے جس کی اپنی تاریخ ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد قانونی طور پر اس ملک کا نام ''بھارت'' کے طور پر متعارف کیا گیا۔ اس وقت ملک کا نام بھارت ہے اور بھارت کے قومی جھنڈے کا نام ''ترنگا'' رکھا گیا۔ یہ جھنڈا نہ صرف ملک کی پہچان ہے بلکہ آزادی کی طویل جدوجہد کی علامت بھی ہے۔ 22 جولائی ۱۹۴۷ء کو پارلیمنٹ میں ''ترنگے'' کو قومی جھنڈا تسلیم کیا گیا اور یہ قوم کی آزادی کی پہچان قرار پایا۔

آزادی سے پہلے کے جھنڈے

سسٹر نویدتا کا جھنڈا ۱۹۰۴ء:

بھارت کی آزادی سے پہلے کے جھنڈوں کی شروعات ۱۹۰۴ء میں ہوئی، جب سوامی ویویکانند کی شاگردہ سسٹر نویدتا نے پہلا قومی جھنڈا بنایا۔ اس جھنڈے میں پیلا اور لال رنگ استعمال ہوئے تھے۔ پیلا رنگ کامیابی کی علامت اور لال رنگ آزادی کی جدوجہد کے لیے تھا۔(History of Indian National Flag, Bipan Chandra, 2010)

۱۹۰۶ء کا جھنڈا:

سسٹر نویدتا کے پرچم کے بعد ۱۹۰۶ء میں دوسرا قومی جھنڈا بنایا گیا جس میں نیلا، پیلا اور لال رنگ کی پٹیاں شامل کی گئیں۔ نیلے رنگ میں سورج اور تارے کا نشان بنایا گیا۔ بعد میں رنگوں کو تبدیل کر کے نارنگی، پیلا اور ہرا رنگ استعمال کیا گیا اور اسے ''کمل جھنڈا''

یا ''کلکتہ جھنڈا'' کہا گیا۔ اس جھنڈے کا مقصد قومی یکجہتی اور آزادی کی جدوجہد تھی۔

۱۹۰۷ء کا جھنڈا:

۲۲ اگست ۱۹۰۷ء کو شیام جی کرشن ورما، میڈم بھیکا جی کاما اور ویر ساورکر نے ایک نیا پرچم ترتیب دیا، جسے ''برلن کمیٹی پرچم'' کہا گیا۔ اس جھنڈے میں تین رنگ شامل تھے: اوپر ہرا، بیچ میں سنہری اور نیچے کیسریا۔

۱۹۱۶ء کا جھنڈا:

۱۹۱۶ء میں لوکمانیہ تلک اور ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے جھنڈا بنایا، جسے کلکتہ اجلاس میں پیش کیا گیا۔ اس میں سفید، ہرا، نیلا اور لال رنگ استعمال ہوئے اور پانچ لال اور چار ہرے رنگ کی پٹیوں سے شیر کی شکل بنائی گئی۔ سفید پٹی میں سات ستارے تھے جو سات رشیوں کی علامت تھے۔

مہاتما گاندھی کا تین رنگی جھنڈا ۱۹۲۱ء:

۱۹۲۱ء میں مہاتما گاندھی نے آئرلینڈ کی سسٹر نویدتا کے جھنڈے کے نمونے پر تین رنگوں والا پرچم بنایا: سفید، ہرا اور لال۔ سفید رنگ سچائی، ہرا رنگ زراعت اور لال رنگ طاقت اور آزادی کی جدوجہد کی علامت تھا۔

۱۹۳۱ء کا جھنڈا:

۱۹۳۱ء میں بنگالی پنگلی وینکیا نے جھنڈا ترتیب دیا۔ اس میں اوپر کیسریا، بیچ میں سفید اور نیچے ہرا رنگ تھا۔ سفید کے بیچ میں نیلا رنگ کا چرخہ بنایا گیا جو ۲۴ کانٹوں پر مشتمل تھا، جسے بعد میں اشوک چکر کہا گیا۔

آزادی کے بعد کا جھنڈا

۱۹۴۷ء میں تین رنگوں والے پرچم میں تھوڑی تبدیلی کی گئی اور چرخہ کی جگہ اشوک چکر کو رکھا گیا۔ چونکہ قومی پرچم میں تین رنگوں کا استعمال ہوا، اس لیے اسے ''ترنگا'' کہا

گیا۔آزادی کے بعد ایک جھنڈا کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر راجندر پرساد تھے جس میں بدر الدین طیب اور سریا طیب کے مشورہ سے چرخے کو ہٹا کر چکر کی تجویز کو پیش کیا،صدر راجندر پرساد نے اس ڈیزائن کو منظوری دی۔ اس طرح بدرالدین طیب اور سریا طیب کے مشورے سے سفید پٹی پر چرخے کو شامل کیا گیا اور ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو پارلیمنٹ میں قومی جھنڈے کی شکل میں اسی ڈیزائن کو تسلیم کیا گیا۔ یہ جھنڈا ملک کی آزادی کی جدوجہد کی علامت ہے۔

(The National Flag of India, Ministry of Culture, Government of India 2020)

ترنگا جھنڈا کی حقیقت

ہندوستانی پرچم کو ترنگا کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے''تین رنگوں والا''۔ ۱۹۳۱ء میں ہندوستانی پرچم کے رنگوں کی شناخت اس وقت کی دو بڑی قوموں کے لیے کی گئی: زعفرانی رنگ ہندو قوم کی اور سبز رنگ مسلم قوم کی علامت تھا، جبکہ بیچ والا سفید رنگ امن اور سچائی کی علامت تھا۔

- اوپر کیسریا رنگ قربانی، ہمت اور طاقت کی علامت
- سفید رنگ امن اور صداقت کی علامت
- نیلا اشوک چکر، ۲۴ کانٹوں پر مشتمل، قانون اور زندگی کی علامت
- ہرا رنگ زمین، زراعت اور خوشحالی کی علامت
- ترنگے کی لمبائی اور چوڑائی کی نسبت 3:2 ہے اور سفید پٹی کے بیچ میں نیلا اشوک چکر رکھا گیا۔

قومی پرچم اور قانونی ضابطہ

قومی جھنڈے کی تیاری کا کام''بیورو آف انڈین اسٹینڈرڈز'' کرتی ہے۔قومی پرچم قانون کے مطابق ابتدا میں صرف ۱۵ اگست (یوم آزادی) اور ۲۶ جنوری (یوم

جمہوریہ) کے مواقع پر لہرانے کی اجازت تھی۔ ۱۵ جنوری ۲۰۰۲ء کو دہلی ہائی کورٹ نے قانون پاس کیا کہ شہری سال بھر کسی بھی دن قومی پرچم لہرا سکتے ہیں۔

قومی پرچم کے لیے کچھ پابندیاں

۱۔کیسریا رنگ ہمیشہ اوپر ہونا چاہیے۔
۲۔قومی پرچم فرقہ واریت کے لیے استعمال نہ ہو۔
۳۔سورج طلوع سے غروب تک ہی لہرا جائے۔
۴۔زمین یا فرش سے نہ لگے، نہ پردے پر لٹکایا جائے۔
۵۔اس پر کوئی دوسرا جھنڈا، نشان یا پھول نہ لگایا جائے۔
۶۔ترنگے سے کوئی دوسرا سامان نہ بنایا جائے۔
۷۔بے حرمتی پر تین سال تک سزا یا جرمانہ ہوسکتا ہے۔

(The Prevention of Insults to National Honour Act, 1971, Government of India)

اس طرح ہندوستان کا دستور اور جھنڈا ایسا ہے جس میں تمام قوموں کی رعایت ہے اللہ تعالیٰ اس ملک کو امن وامان کا گہوارہ بناتے ہوئے تمام انسانوں کو ھدایت عطا فرما کر مالک حقیقی کے قانون کے مطابق عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ والسلام

دعاؤں کا طالب
محمد سرور فاروقی ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
۲۵/۱/۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خلاصہ

جنگ آزادی کی مختصر تاریخ ایک نظر میں

- ۳۲۵ق م: سب سے پہلے سکندر اعظم مقدونی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔
- ۱۲۹۴ء: اطالوی سیاح مارکو پولو نے ہندوستان کا سفر کیا اور یورپ کو یہاں کی خوشحالی دکھائی۔
- ۱۴۹۸ء: پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما سمندری راستے سے ہندوستان آیا۔

انگریزوں کی آمد

- ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء: ملکہ الزبتھ اوّل نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کی اجازت دی۔
- ۱۶۰۸ء: کپتان ولیم ہاکنس مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار میں آیا۔
- ۳۱ مئی ۱۶۲۳ء: کمپنی کو سورت میں تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت ملی۔
- ۱۶۳۹ء: مدراس (چنئی) میں فورٹ سینٹ جارج قائم ہوا۔
- ۱۶۶۱ء: پرتگالیوں سے بمبئی انگریزوں کو ملی (شاہ چارلس دوم کی شادی کے جہیز میں)۔
- ۱۶۹۰ء: کلکتہ میں تجارتی مرکز قائم ہوا، جو بعد میں فورٹ ولیم کہلایا۔
- ۱۶۹۸ء: انگریز قزاق ہنری ایوری نے مغل سلطنت کے بڑے بحری جہاز ''گنج سوائی'' کو لوٹ لیا۔
- ۱۷۰۷ء: اورنگ زیب عالمگیرؒ کے انتقال کے بعد مغل سلطنت کمزور ہونے لگی، جانشینی کے جھگڑے اور صوبائی بغاوتیں شروع ہوگئیں۔

کرناٹک کی جنگیں (انگریز بمقابلہ فرانسیسی)

- ۱۷۴۶ء تا ۱۷۴۸ء: پہلی جنگ فرانسیسیوں نے مدراس پر قبضہ کیا مگر بعد میں واپس کرنا پڑا۔

● ۱۷۴۹ء تا ۱۷۵۴ء: دوسری جنگ انگریزوں نے رابرٹ کلائیو کی قیادت میں برتری حاصل کی۔

● ۱۷۵۸ء تا ۱۷۶۳ء: تیسری جنگ انگریزوں نے فیصلہ کن فتح حاصل کی۔

انگریزوں کا سیاسی عروج

● ۲۳ جون ۱۷۵۷ء: جنگ پلاسی؛ میر جعفر کی غداری سے نواب سراج الدولہ شکست کھا گئے بنگال پر انگریز قابض ہو گئے۔

● ۲۲ اکتوبر ۱۷۶۴ء: جنگ بکسر؛ انگریزوں نے مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کی اور انگریز تاجر سے حکمران بن گئے۔

● ۱۸۵۷ء کے بعد: آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر قید کر کے رنگون جلاوطن کر دیے گئے۔

علی وردی خاں اور پلاسی کا پس منظر

● ۱۷۵۶ء: علی وردی خاں کے بعد نواب سراج الدولہ حکمران بنے لیکن علی وردی خاں نے نصیحت کی تھی کہ: ''انگریزوں کو کبھی قلعہ یا فوج بنانے کی اجازت نہ دینا''۔

● مگر میر جعفر اور مانک چند جیسے درباری انگریزوں کے ساتھ مل گئے پلاسی کی شکست (۱۷۵۷ء) میں ہوئی۔

ابتدائی مزاحمت

● ۱۷۵۱ء نواب علی وردی خان نے انگریزوں کو کلکتہ (فورٹ ولیم، ڈائمنڈ ہاربر) سے بے دخل کیا۔

● ۱۷۵۷ء جنگِ پلاسی: نواب سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقابلہ کیا مگر میر جعفر کی غداری سے شہید ہو گئے؛ انگریزوں کا بنگال پر قبضہ ہوا۔

● ۱۷۶۴ء جنگِ بکسر: نواب میر قاسم، نواب شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ شاہ عالم دوم نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی؛ شکست کے بعد انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ملی۔

● ۱۷۸۲ء حیدر علی کا انتقال، انگریزوں کے خلاف مستقل جنگ کے بعد۔

● ۱۷۸۳ء تا ۱۷۸۴ء دوسری جنگِ میسور: ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو شکست دی۔

● ۱۷۹۲ء تیسری جنگِ میسور: غداری اور کمزوریوں کے سبب ٹیپو سلطان کو سخت معاہدہ کرنا پڑا (آدھی سلطنت + بھاری تاوان + شہزادے یرغمال)۔

● ۴ مئی ۱۷۹۹ء سرنگاپٹم کی چوتھی جنگ: ٹیپو سلطان آخری دم تک لڑتے ہوئے شہید ہوئے، انگریزوں کا جنوبی ہند پر مکمل قبضہ ہوگیا۔

ولی اللّٰہی تحریک (۱۷۰۳ء تا ۱۸۲۴ء)

● شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۲ء) قرآن کا ترجمہ، اصلاحی تحریک، اتحاد کا پیغام۔

● شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (۱۷۴۶ء تا ۱۸۲۴ء) ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریز قبضے کے بعد تاریخی فتویٰ ۱۸۰۳ء میں دیا کہ: ''ہندوستان دارالحرب ہے''۔

تحریکِ جہاد (۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء)

● سید احمد شہیدؒ بریلوی (۱۷۸۶ء تا ۱۸۳۱ء) اور شاہ اسماعیل شہیدؒ دہلوی (۱۷۷۹ء تا ۱۸۳۱ء) نے جہاد کی قیادت، عوامی بیداری اور دینی اصلاح کی تحریک۔

● ۱۸۲۶ء تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔

● ۶ مئی ۱۸۳۱ء بالاکوٹ کی جنگ میں دونوں قائدین جامِ شہادت نوش کر گئے۔

۱۸۵۲ء-۱۸۵۷ء: قیادت اور تحریک

● مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ اور مولانا عنایت علیؒ نے تحریکِ جہاد کو زندہ رکھا۔

● انگریزوں نے اسے ''وہابی تحریک'' کہا، حقیقت میں یہ ولی اللّٰہی تحریک تھی۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

● ۱۸۵۶ء دہلی میں علما کی میٹنگ؛ فیصلہ کیا گیا کہ انگریزوں کے خلاف عملی جدوجہد کی جائے۔

● ۱۸۵۷ء جنگِ آزادی کا آغاز؛ یہ محض فوجی بغاوت نہیں بلکہ دینی و عوامی تحریک تھی۔

آزادی میں مسلمانوں کا کردار

● ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سب سے پہلی منظم جدوجہد مسلمانوں نے کی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو اس جنگ کا قائد بنایا گیا، علماء جیسے: مولوی احمد اللہ شاہ، فضل حق خیرآبادی، اور مفتی عنایت اللہ نے قیادت کی۔ اور مسلمانوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دیں۔

● ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۱ء کا دور: اس دور میں انگریزوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو نشانہ بنایا، لیکن ''علمائے دیوبند'' نے ''تحریکِ ریشمی رومال'' اور آزادی کی خفیہ تحریکیں چلائیں۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید کی قربانیوں کا اثر اسی عرصے میں نمایاں رہا۔

● ۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۰ء مسلمانوں نے خلافت تحریک (۱۹۱۹ء) اور ہجرت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور حکیم اجمل خان نے تحریک کو نئی قوت بخشی۔

● ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء: اس دور میں مسلمانوں نے جدوجہد کو فیصلہ کن مرحلے تک پہنچایا۔ جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار، اور مسلم لیگ سبھی نے آزادی کی کوششوں میں کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۲ء کی Quit India Movement اور بالآخر ۱۹۴۷ء کی آزادی میں مسلمانوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

شاملی کی جنگ (۱۸۵۷ء، ضلع مظفرنگر)

● امیر لشکر: حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ۔ ۔صفِ اوّل قیادت: مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا منیر نانوتویؒ۔ ۔قربانی: حافظ ضامن شہیدؒ نے جان دی۔

قربانیاں اور جلاوطنی

● مولانا فضلِ حق خیرآبادیؒ نے بھی جہاد کا فتویٰ دیا گرفتار ہوکر انڈمان (کالا پانی) جلاوطن ہوئے اور وہیں وفات پایا۔

● ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۵ء کے دوران ہزاروں علماء کو پھانسی، قید اور جلاوطنی کی سزائیں دی گئیں

اور ۱۸۶۵ء میں کئی علماء انڈمان جلاوطن کیے گئے۔

● ۱۸۸۳ء مولانا جعفر تھانیسریؒ اور مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ ۱۸ سال قید ومشقت کے بعد رہا ہوئے۔

انگریزوں کی انتقامی پالیسی (۱۸۵۸ء کے بعد)

● ۱۸۵۸ء ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی رپورٹ: مسلمانوں کے ایمان اور علما کو ختم کیے بغیر حکومت ممکن نہیں۔

● ۱۸۶۱ء تین لاکھ قرآن جلائے گئے۔

● ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۷ء "المناک تین سال"؛ ۱۴ ہزار علماء شہید کئے گئے۔

● لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی (۱۸۳۵ء) کو شدت سے نافذ کیا گیا؛ مقصد ایسی نسل تیار کرنا جس کے "جسم ہندوستانی، دماغ انگریز" ہوں۔

نئی تعلیمی وفکری تحریکات

● ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ)۔

● ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ تحریک (سرسید احمد خان)۔

● ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ تحریک (مولانا محمد علی مونگیریؒ، شبلی نعمانیؒ)۔

سیاسی جدوجہد

● ۱۸۸۵ء انڈین نیشنل کانگریس کا قیام۔

● ۱۹۱۲ء ریشمی رومال تحریک (شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شاگرد: عبیداللہ سندھیؒ)۔

● ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء گرفتاری اور مالٹا جلاوطنی۔

● ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء تحریکِ خلافت (مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ)۔

● ۱۹۱۹ء میں جمعیت علمائے ہند کا قیام، ترکِ مصنوعات کا فتویٰ۔

● ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ سانحہ پیش آیا۔

- ۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات اور نان کوآپریشن تحریک۔
- ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی جوہرؒ کی لندن میں وفات ہوئی اور بیت المقدس میں تدفین۔

آزادی کے آخری مراحل

- ۱۹۴۲ء میں ہند چھوڑو تحریک؛ لاکھوں مسلمان اور ہزاروں علماء قربان ہوئے۔
- ۱۹۴۶ء دستور ساز اسمبلی کا اجلاس؛ مسلمان نمائندوں (ابوالکلام آزادؒ، خان عبدالغفار خان وغیرہ) نے بھرپور کردار ادا کیا۔
- ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔

❁❁❁